اِلیٰ رَبِّکَ مُنتَہٰہَا

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم، منزل ما کبریاست

رومی

جاوید نامہ

مترجمہ رفیق خاور

دانائے راز

بسلسلۂ صد سالہ جشنِ ولادت حکیم الامّت علاّمہ اقبالؒ

نومبر ۱۹۷۷ء

اِلیٰ رَبِّکَ مُنتَہٰہَا

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم، منزل ما کبریاست

رومی

جاوید نامہ

اقبالؒ

مترجمہ رفیق خاور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طبع اوّل ——— ۱۹۷۶ء

تعداد ——— ۱۱۰۰

قیمت ——— ۲۵ روپے

ناشر

ڈاکٹر محمد معزّالدین

ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان

۹۰ / بی — ۲ ، گلبرگ ۳ ، لاہور

مطبع

پرنٹ آرٹس

مدنی مارکیٹ ، ۳۰ ریلوے روڈ ، لاہور

ترتیب

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	پیش لفظ — ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	ک
	مقدمہ — رفیق خاور	یا
۱	مناجات	۱
۲	تمہید آسمانی: روزِ ازل آسمان کی زمین پر طعنہ زنی	۶
۳	نغمۂ ملائک	۸
۴	تمہید زمینی: حضرت رومی کی روح ظاہر ہو کر اسرارِ معراج بیان کرتی ہے۔	۹
۵	زروان، زمان و مکان کی روح، مسافر کو عالمِ بالا کی سیر کراتی ہے۔	۱۷
۶	زمزمۂ انجم	۱۹
	فلکِ قمر	۲۱
۷	ہندی رشی جو چاند کے ایک غار میں آسن جمائے بیٹھا تھا اور اہل ہند اسے وشوامتر (جہاں دوست) کہتے ہیں۔	۲۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۸	ہندی رشی کی نوگیان گن کی باتیں	۲۹
۹	جلوۂ سروش	۳۲
۱۰	نوائے سروش	۳۳
	وادیٔ یرغمید کی سیر جسے ملائکہ وادیٔ طواسین کہتے ہیں	۳۴
	طاسینِ گوتم، رقاصہ کا تائب ہونا	۳۷
۱۳	طاسینِ زرتشت: اہرمن کے ہاتھوں زرتشت کی آزمائش	۴۰
۱۴	طاسینِ مسیح، حکیم طالستائی کا خواب	۴۳
۱۵	طاسینِ محمد، خانۂ کعبہ میں روحِ ابوجہل کا نوحہ	۴۶
	فلکِ عطارد	۴۹
۱۶	جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح کی زیارت	۵۱
۱۷	دین و وطن	۵۴
۱۸	اشتراکیت اور ملوکیت	۵۷
۱۹	مشرق اور مغرب	۵۸
۲۰	عالمِ قرآنی کے محکمات	۶۱
۲۱	خلافتِ آدم	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۲	حکومت الٰہی	۶۴
۲۳	زمین خدا کی ملکیت ہے	۶۶
۲۴	حکمت خیر کثیر ہے	۶۷
۲۵	ملتِ روسیہ کو افغانی کا پیغام	۷۲
۲۶	زندہ رود کی غزل	۷۷
	فلکِ زہرہ	۷۹
۲۷	خدایانِ قدیم کی انجمن	۸۱
۲۸	نغمۂ لعل	۸۵
۲۹	دریائے زہرہ میں غوطہ زن ہوکر فرعون اور کیخسرو کی روحوں سے ملاقات	۸۷
۳۰	درویش سوڈانی کا ظہور	۹۱
	فلکِ مریخ	۹۵
۳۱	اہلِ مریخ	۹۷
۳۲	مریخی انجم شناس کی رصد گاہ سے باہر آمد	۹۹
۳۳	شہرِ مرغدین کی سیر	۱۰۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۴	دوشیزۂ مریخ کے حالات جس نے رسالت کا دعویٰ کیا۔	۱۰۶
	فلکِ مشتری	۱۱۱
۳۵	حلاج، غالب اور قرۃ العین کی ارواح جنہوں نے بہشت میں قیام پسند نہ کیا اور گردشِ پیہم کی دلدادہ رہیں۔	۱۱۳
۳۶	نوائے حلاّج	۱۱۵
۳۷	نوائے غالب	//
۳۸	نوائے طاہرہ	۱۱۶
۳۹	زندہ رود اپنے مسائل ان ارواح کے سامنے پیش کرتا ہے۔	۱۱۷
۴۰	خواجۂ اہلِ فراق کا نمودار ہونا	۱۳۴
۴۱	نالۂ ابلیس	۱۳۷
	فلکِ زحل	۱۳۹
۴۲	وہ ذلیل روحیں جنہوں نے ملک و ملت سے غداری کی اور دوزخ نے بھی انہیں قبول نہ کیا۔	۱۴۱
۴۳	قلزمِ خونیں	۱۴۲
۴۴	روحِ ہندوستان کی نمود	۱۴۳

برشمار	مضمون	صفحہ
۴۵	روحِ ہندوستان کا نالہ وشیون	۱۴۳
۴۶	خونیں سمندر کے ایک کشتی نشیں کی فریاد	۱۴۵
	آں سوئے افلاک	۱۴۷
۴۷	جرمن فلسفی نطشہ کا مقام	۱۴۹
۴۸	جنت الفردوس کی سیر	۱۵۲
۴۹	شرف النساء کا ایوان	۱۵۴
۵۰	امیر کبیر حضرت سید علی ھمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری کی زیارت	۱۵۶
۵۱	شاہِ ھمدان کے حضور میں	۱۵۷
۵۲	ہندی کوی برتری سے ملاقات	۱۶۶
۵۳	سلاطینِ مشرق کے ایوانوں میں نقل وحرکت	۱۶۹
۵۴	ناصر خسرو علوی کی روح نمودار ہوتی ہے اور مستانہ غزل گاکر رخصت ہو جاتی ہے۔	۱۷۳
۵۵	سلطان شہید کا پیغام دریائے کاویری کے نام (زندگی اور شہادت کی حقیقت)	۱۸۱
۵۶	زندہ رود کی فردوس سے روانگی اور حورانِ بہشت کا تقاضا	۱۸۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۷	زندہ رود کی غزل	۱۸۵
۵۸	حضور	۱۸۶
۵۸	جاوید سے خطاب (نئی پود سے کلام)	۱۹۵

بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

پیش لفظ

ڈاکٹر سید عبداللہ

رفیق خاور صاحب نے انگریزی، فارسی اور پنجابی نظموں کے اردو مترجم کی حیثیت سے جو رتبہ حاصل کر لیا ہے اس پر مجھے تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ عیاں را چہ بیاں اب وہ ہمارے قابلِ اعتماد مترجم ہیں۔ بہر حال میں اس وقت یہ پر مسرت اطلاع دینے کے لئے قلم اٹھا رہا ہوں کہ اب خاور نے قوم کو حکیم مشرق کی بلند پایہ نظم جاوید نامہ (فارسی) کے منظوم اردو ترجمے کا تحفہ عطا کیا ہے۔ جو عنقریب اقبال اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔

جاوید نامہ کی عظمت کیا ہے؟ اس وقت یہ میرا موضوع نہیں۔ میرا موضوع فقط یہ ہے کہ رفیق خاور اپنے ترجمے میں جاوید نامہ کے معانی اور فضا کو کہاں تک منتقل کر سکا ہے۔ لہٰذا میری گذارشات کا محور یہی ایک نکتہ ہو گا۔

ہمارے یہاں (معلوم نہیں کیوں) یہ خیال عام طور سے پھیل گیا ہے کہ ترجمہ اور تخیل

تخلیق کی برابری کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ مترجم کی مشکلات اور دشواریوں کو سب جانتے ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کے کٹھن ہونے کا سبھی کو اقرار ہے مگر خیال بالآخر سب کا یہی ہے کہ ترجمہ ترجمہ ہے لہٰذا اسے بہر حال اوریجنل تخلیق سے کہتر ہونا ہی چاہیئے۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے ترجمے ایسے ہوتے بھی ہیں جنہیں واقعی کسی رتبے کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مگر یہ بات خود اوریجنل تخلیق پہ بھی صادق آتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر تخلیق رتبے کی مالک اور تعریف و اعتراف کے لائق ہوتی ہے؟

تو نتیجہ یہ نکلا کہ انحصار فقط آداب اور معیاروں پہ ہے۔ جس طرح کسی اوریجنل تخلیق کی عمدگی کے کچھ معیار اور آداب ہوتے ہیں اسی طرح ترجمے کی عمدگی کے بھی کچھ معیار اور آداب ہیں۔ ترجمہ یا تخلیق جو چیز بھی اپنے خاص معیار پہ پوری اتر گئی وہی عمدہ اور معیاری ہو گئی۔ اور اگر بات مشکلات کے نقطۂ نظر سے کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ مترجم کو دُہری مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مشقت تخلیق کار کے باطن میں داخل ہو کر اور اسے تلاش کر کے سامنے لے آنے کی، اور دوسری مشقت تخلیق اوّل کے بارے میں اپنے رچے بسے ہوئے تجربات و معانی کو اس کے اسلوب سمیت ظہور میں لانے کی۔ بلا شبہ شاعر اور تخلیق کار کا عمل بھی کچھ کم کربناک نہیں ہوتا، کیونکہ اسے بھی بعض اوقات "دہری ولادت" کے سلسلے سے گذرنا پڑتا ہے اور پیچ در پیچ داخلی و خارجی تہیجات میں مبتلا ہو کر تجربے کو متشکل کرنا پڑتا ہے

لہٰذا یہ بھی سخت کام ہے۔

لیکن اتفاق کیا جائے گا کہ عمل کی ان دو صورتوں کے مابین ایک نمایاں فرق بھی ہے، اور وہ یہ کہ جہاں تخلیق کار اول (شاعر) اپنا ہی بوجھ اٹھاتا ہے وہاں بچارے مترجم کو تخلیق کار کے بوجھ کے ساتھ اپنا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ذمہ داری، تخلیق اول کو نئے وطن میں لے جاکر اس کی مربیانہ پرداخت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کے دوران اس کو تخلیق کار کے جملہ تجربات کو اپنے تجربات کے اندر جذب کر لینا پڑتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ بھی تخلیق کار بن جاتا ہے۔ مگر ایسا تخلیق کار جس کے سر پر ہر وقت "منت غیر" کی تلوار بھی لٹک ہوئی ہوتی ہے۔ اور یہی اس بچارے کی بدنصیبی ہے۔

اور وہ مترجم اور بھی زیادہ قابلِ ہمدردی ہوتا ہے جس کی قسمت میں کسی عظیم نابغہ ادب کی تخلیق کی "مترجمی" لکھی ہوتی ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تو نتیجہ یہ نکلا کہ ترجمے کا کام بھی عاشق کے گریبان کا سا ہے کہ قطعی تقدیر اس کی ملامت، اور سزا اس کی "منتِ غیر" کا طعن ہے۔

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ اس ملامت کی بڑی ذمے داری بڑی حد تک خود مترجمین پر ہے۔ جتنا بھی کوئی مترجم اس احساس کے دباؤ میں لکھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھا رہا ہے،

اتنا ہی اس کا عمل منتِ غیر کی ملامت کا مورد ہوگا - اسی وجہ سے معاملہ فہم مترجمین اس بوجھ سے آزاد ہوکے چلتے ہیں، وہ تخلیق کار کے عمل سے شہد کی مکھی کی مانند رس چوس لیتے ہیں اور اور اپنے عمل سے اس کا جوہر بدل دیتے ہیں خواہ اس کے اجزائے ترکیبی میں اصل تخلیق اپنی غالب حیثیت ہی سے کیوں موجود نہ ہو -

جب فٹز جیرلڈ نے رباعیاتِ عمر خیام کو "انگریزی دنیا" کے سامنے پیش کیا تو اس نے ترجمہ نہیں کیا۔ شہد کی مکھی کے مانند خیام کے پھولوں سے چوسا ہوا رس پیش کیا - چنانچہ فٹز جیرلڈ کی رباعیات کو اس کے مقدمہ نگار (LAWRENCE HOUSMAN) نے ترجمہ نہیں کہا، بلکہ ایک طلب خیز الہامی شرح (INSPIRED PARAPHRASE) کہا ہے، اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے ان دو لفظوں میں ترجمہ کرنے والوں کو ملامت سے بچانے کے لئے ایک راہ نجات بھی بتادی ہے -

یہ الہامی شرح نگاری کیا ہے ؟ ایک دیئے ہوئے متن کا ایسا ترجمہ جو اصل کی روح کو تو برقرار رکھے مگر اس کی تخیلی فضا تیار کرنے میں آزاد ہو - لہٰذا فٹز جیرلڈ کے ترجمے میں خیام کی روحِ نشاط اور جو طربِ بھی ہے، مگر اس کی تشبیہات و لفاظیہ اپنی ہیں - اسی کو ہاڈس مین نے الہام کی آمیزش کہا ہے -

یہ سوال قدرتی ہے کہ اس الہامی آمیزش کی خارجی صورتیں کیا کیا ہیں ؟ جیسا کہ بیان ہوا ہے ایک صورت تو یہ ہے کہ شاعر اصل کا پابند ہوکر نہیں چلا بلکہ اصل کو پڑھ کر جو تاثر اس

کے دل میں پیدا ہوا اسے اس نے اپنے "ورشن" میں زندہ کر دیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے عملِ ثانی (تخلیقِ مکرر) میں دوسرے کی تخلیق سے خاصا آزاد ہو کر سرگرمِ عمل ہوا ہے۔

خیر۔ یہ امر تو سخت دشوار ہے کہ کوئی شخص تخلیقِ مکرر کے اس عمل میں تخلیقِ اول کو بالکل فراموش کر دے، لیکن یہ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ کم از کم اس کا قاری ضرور فراموش کر دے کہ میں ترجمہ پڑھ رہا ہوں، اسے چاہیے کہ ترجمہ کو خصوصاً شاعری میں تخلیقِ ثانی کو اوریجنل سمجھ کر پڑھے لیکن یہ اس پر موقوف ہے کہ ترجمہ نگار اپنی تخلیق میں وہ جادو جگا دے، یا وہ خوبیاں پیدا کر دے جن کے باعث قاری کا ذہن ادھر متوجہ ہی نہ ہو کہ وہ دو فنکاروں کے درمیان کسی برزخ میں جی رہا ہے۔ ورنہ مقابلہ و موازنہ شروع ہو جائے گا۔ اور اس سلسلۂ عمل میں بیچارا ترجمہ کرنے والا ہی گھاٹے میں رہے گا۔ اصل فنکار کا کچھ نہ بگڑے گا۔

لیکن یہ یاد رہے کہ ہر ترجمہ کرنے والا اتنا آزاد ہو کر نہیں چل سکتا۔ معلوماتی اور فکری نثر میں تو یہ ممکن ہی نہیں، لیکن خود شاعری میں بھی یہ آزادی نہ ہر کسی کو میسر ہے نہ ہر کسی کے لئے جائز ہے۔ خصوصاً ان نابغہ شعراء کے معاملے میں جنہیں مقدسین کا درجہ مل چکا ہو۔ اس صورت میں اصل متن سے سرِ مو انحراف بھی ترجمہ کرنے والے کے لئے باعثِ تکلیف بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الہامی کتابوں کے ترجموں کے بارے میں صدیوں تردد و تامل رہا ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق میں ترجمے کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

میں ترجمے کی مشکلات کے موضوع پر شاید ضرورت سے کچھ زیادہ لکھ رہا ہوں۔ لیکن

مجبوری یہ ہے کہ ان مشکلات کا احساس دلائے بغیر جاوید نامہ کے موجودہ ترجمہ نگار کی میں کوئی خدمت نہیں کر سکتا، کیونکہ میرا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے قارئین کو بدلائل مطمئن کردوں کہ ہمارے ترجمہ نگار نے اپنے فن کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ترجمہ نگار سے ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ اس سے تقاضا صرف یہ ہے کہ وہ ہمیں اصل کتاب کی روح سے بھی آشنا کرے اور اس کے ساتھ ہی اس کتاب کی فضا کو بھی اپنی زبان میں منتقل کر دے اور اس سے بھی بڑی اہم خدمت یہ کرے کہ اپنے "ورژن" VERSION کو قاری کے لئے ایسا بنا دے کہ اسے اصل فراموش ہو جائے تاکہ وہ اسی ورژن کو مستقل اور قائم بالذات تخلیق سمجھ کر پڑھے اور اطمینان اور مسرت کی ایسی سرشاری اسے حاصل ہو جائے کہ وہ اصل سے بے نیاز ہو جائے۔

کسی نظم کے عناصر ترکیبی اصولاً تین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ (۱) مضامین و معانی (۲) موسیقی اور (۳) تصویر۔ ترجمہ نگار کی اصل آزمائش یہ ہے کہ وہ مضامین و معانی کے موثر بنانے کے لئے متناسب موسیقی اور تصویر سے کہاں تک نباہ کر سکا ہے۔ کیونکہ ہر زبان میں موسیقی (بحر و آہنگ) اور تصویر (یعنی تشبیہات و استعارات) کے انداز جدا ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ ترجمہ نگار کی مشکل دہری ہے، اسے پہلے مصنف اور شاعر کی تصویری و موسیقیانہ فضا کو قائم رکھنا ہوتا ہے اور پھر اپنی زبان کی مناسبت سے اپنی موسیقی اور تصویر کی فضا پیدا کرنی ہوتی ہے تاکہ تخلیق مکرر کا قاری محظوظ بھی ہو سکے اور چاہے تو اصل ورژن

سے بے نیاز ہو کر ترجمے کو مستقل کتاب کے طور پر پڑھے، محظوظ ہو، اور وہ روحِ مطالب بھی اس کی گرفت میں آجائے جو اصل میں موجود تھی۔

اب میں تھوڑی دیر گفتگو کو چھوڑ کر رفیق خاور کے منظوم اردو ترجمہ جاوید نامہ کی کی طرف آتا ہوں۔

جاوید نامہ، ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی (طربیہ خداوندی) کی طرح ایک کثیر الالوان کتاب ہے۔ اس میں مکالمہ بھی ہے اور بیانِ واقعات بھی، فضا بھی ہے اور صوت بھی، صدا بھی ہے اور ادا بھی، اشارت بھی ہے اور عبارت بھی، یہ ایک تمثیل ہے مگر مثالی دنیا کی۔ یہ مثالی دنیا کی روداد ہے مگر حقیقی دنیا کے دامن سے وابستہ ہے۔ اس میں حقیقی شخصیتیں بھی ہیں، اور افسانوی بھی، خیالی کردار بھی ہیں اور مثالی بھی، اس میں غزل کے پیوند بھی نظر آتے ہیں اور قطعہ بندی بھی ہے۔ غرض تخیلی اور واقعاتی رنگ باہم شیر و شکر ہیں۔ اس میں حقائقِ فکری بھی ہیں اور جذباتِ قلبی بھی، اس میں وہ تاریخ بھی ہے جس کے نقوش ماضی کے اوراق میں ثبت ہیں۔ اور وہ تاریخ بھی جس کی تصویریں شاعر کے وژن (VISION) میں ہیں۔ غرض ایک مرقع ہے جس میں فکر و خیال کا ہر رنگ پیوستہ اور باہم وابستہ ہے۔ اور اہل نقد و نظر کا خیال ہے کہ یہ ایلیڈ اور ڈیوائن کامیڈی کی طرح عجائبات ادب میں سے ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کثیر الالوان کتاب جسے ارژنگ معانی اور منقش ماضی کہیئے، کسی

دوسری زبان میں منتقل کئے جانے کے لئے بڑی ہی قادر الکلامی کا تقاضا کرتی ہے۔

یہ رفیق خاور کی ہمتِ عالی ہے کہ اس نے اس ارتنگِ فکر کو اردو نظم میں منتقل کرنے کا حوصلہ کیا ہے۔ اور اب یہ قفسِ رنگ قارئین کے سامنے ہے۔ قفس رنگ اسلئے کہ "جاوید نامہ" کے گریزپا اور گرفت میں نہ آنے والے معانی اردو کے قالب میں مسخر ہو گئے ہیں۔

خاور کی مشکلات بے انتہا تھیں، جاوید نامہ کے بلند مرتبہ مصنف کا مقامِ رفیع، مضامین کی فکری و فلسفیانہ پیچیدگی و دقت، تلمیحات و اشارات کی بوقلمونی، غزل و قطعہ و مثنوی کی بحور کی مشکلات، اور سب سے زیادہ وہ ارفعیت (SUBLIMITY) جو جاوید نامہ کی فضا سازی میں موجود ہے۔

بااین ہمہ خاور کے لئے ایک آسانی بھی تھی، اور وہ یہ کہ تخلیقِ اول کی زبان کسی اردو دان کے لئے خصوصاً خاور کے لئے کوئی "پرابلم" نہیں، فارسی شعر و ادب کی زبان و بیان اردو کے کسی خوش ذوق ادیب کے لئے ایک مانوس اور معروف زبان و بیان ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی کسی ادبی تخلیق میں فارسی کی تراکیب و الفاظ کا بعینہٖ منتقل ہو جانا کسی طرح مشکل یا ناپسندیدہ امر نہیں، بلکہ مثبت طور پر پسندیدہ معاملہ ہے۔ یوں کہ تخلیق اوّل کی فضا کی منتقلی نہ صرف آسان ہو گئی ہے بلکہ کامیاب بھی ثابت ہوئی ہے۔

پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ اس کی وجہ سے رفیق خاور کو خارا شگافی نہیں کرنی پڑی۔ صحیح یہ ہے کہ اسے "جاوید نامہ" کی سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر ان سے جوئے شیر لانے کے لئے بیحد

محنت کرنی پڑی ہے۔ اس کی بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ جاوید نامہ کے عالی مقام شاعر کے ادب و احترام میں کہیں فرق نہ آنے پائے، کیونکہ کسی جگہ بھی بقدر سرِ مُو اس کے معنی و مطالب کی روح اور اس کی خارجی فضا سازی میں کسر رہ جانا یا کوئی اور فتور فی الحقیقت سوءِ ادب سے کم نہ ہوتا، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رفیق خاور نے جاوید نامہ کی شاعری کے ساتھ ساتھ جاوید نامہ کے شاعر کو بھی مدِ نظر رکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس سے اس کی مشکلات اور ذمے داریوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے، اور یہ خاور کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس مہم سے سرخرو نکلا ہے۔

اس سرخروئی کے سلسلے میں میں نے جو نتیجہ نکالا ہے اس تک پہنچنے کے لئے تقابلی طریق کار بھی ایک جائز طریقہ ہو سکتا ہے، مگر میں نے ایک حد تک اسے اپنانے کے باوجود زیادہ دور تک اس طریقے کو اختیار کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

یہ اس لئے کہ میں اس مقالے کی تمہید میں خود کہہ چکا ہوں کہ قاری تخلیق مکرر کے وقت یہ فراموش ہی کر دے تو بہتر ہوگا کہ وہ کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ لہٰذا میں نے خاور کی تخلیقِ مکرر کو جستہ جستہ مختلف مقامات سے مستقل تخلیق کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ جاوید نامہ اقبال کے حوالے کے بغیر اس میں ایک مستقل تخلیق کی حیثیت سے کہاں تک زندگی اور توانائی موجود ہے۔

اس توانائی و زندگی کی پرکھ (دریافت) اول تو اس بات سے ہوگی کہ بہ حیثیت مجموعی

سارے ادب پارے میں شاعر (مترجم) کا دم پھول تو نہیں گیا۔ کیا وہ ابتدا (مناجات) سے لیکر آخر تک اپنی آواز کو برقرار رکھ سکا ہے۔ میں نے اس غرض سے اس تخلیق مکرر کو کئی جگہ سے پڑھا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعر (مترجم) ہر جگہ تازہ دم ہے۔ اس کی آواز میں توانائی ہر جگہ موجود ہے۔ اور آخری نظم تک اس کا شوق تھکاوٹ میں تبدیل نہیں کیا، دو شخصیتوں کا بارِ گراں اٹھا کر بھی خاورؔ کا سانس اکھڑا نہیں، بلکہ ہر منزل پر پہلے سے زیادہ توانا معلوم ہوتا ہے۔

علاوہ بریں توانائی اور زندگی کی دوسری پہچان یوں ہوتی ہے کہ شاعر (مترجم) تخلیق مکرر میں اردو شاعری کا لہجہ پیدا کر سکا ہے کہ نہیں۔ میرے خیال میں اس منظوم ترجمے میں اردو کا شعری لہجہ موجود ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ اردو کا شعر اپنی ایک خاص شخصیت رکھتا ہے اور یہ شخصیت بھی خاور کی تخلیقِ مکرر میں جلوہ گر ہے۔

اور یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ خاور کے اس ترجمے کا مجموعی انداز بالآخر کچھ اس طرح کا ہو جاتا ہے جیسا خود اقبال کا انداز ان کی اردو نظم میں بالعموم ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ خاورؔ نے اپنے سرچشمۂ فیض کو "بطور شکرانہ" شعوری طور سے ہر لحظہ یاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور رباعیاتِ خیام (فٹز جیرلڈ) کے مقدمہ نگار ہاؤس مین کی اس نصیحت کو نہیں مانا کہ قاری کی طرح مترجم بھی اصل مصنف کو فراموش کرنے کی کوشش کرے۔ خاورؔ نے اس پر عمل نہیں کیا اور پوری کوشش کی ہے کہ اقبال کے لہجے اس کے اپنے اسلوبِ بیان میں جذب ہو جائیں۔

یہ پاسِ ادب کی وجہ سے بھی ہے اور اصل اور ترجمے کی زبان کی قربت کی وجہ سے بھی ۔

ذیل کے چند اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لئے دیئے جا رہے ہیں کہ یہ اصل سے بے نیاز ہو کر بھی اطمینان بخش ہیں ۔

پہلا شاہد کون ہے؟ احساسِ نفس، احساسِ ذات
نور سے اپنے ہی پا لینا متاعِ کائنات!
شاہدِ ثانی شعور اور دل کا بھی، آئینہ وار ۔
جس کی تابانی سے ہو خود اپنا باطن آشکار!
گر رہے اس نورِ حق کے سامنے تو استوار
جانِ خود کو حیّ و قائم صورتِ پروردگار
ایک شاہد کی تمنّا اور ہے معراج کیا
امتحاں ہو رُو برُو جس کے خود اپنی ذات کا
شاہدِ عادل کہ ہے تصدیق جس کی لازمی
ورنہ ہوں گل محض رنگ و بو ہے اپنی زندگی!

اے کہ تو نے طرح نو ڈالی بصد جوش و خروش
مجھ کو دستورِ کہن سے کر دیا بیگانہ کوش

ہم مسلمانوں کی صورت تو نے بھی یورش کناں
قیصریت کے شکستہ کر دیئے ھیں استخواں
تا کرے دل میں فروزاں اپنے اک تازہ چراغ
لے ھماری سرگذشتِ غم سے عبرت کا سراغ
پاؤں مضبوطی سے رکھ اپنا میانِ کارزار
گرد پھرلات و ہبل کے گھوم مت دیوانہ وار
ایسی ملت پر نظر ہے اس جہانِ پیر کی
جو دلائے خوف بھی اور دے نویدِ خیر بھی

ایسے ہی یہ باد و خاک و آب و آتش، ابر و کشت
باغ و راغ و کاخ و کو و لوہ و دشت و سنگ و خشت
تو جو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارا مال ہے
تیری نادانی ہے یہ سب کچھ خدا کا مال ہے
ارضِ حق کو تو بتاتا ہے زمیں اپنی بتا
پھر ہے شرحِ آیۂ لا تفسدوا فی الارض کیا؟

ان اقتباسات سے یہ بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ خاورؔ اپنے عملِ تخلیقِ مکرر میں شاعرِ

تخلیقِ اوّل کے احساس یا موجودگی کے خیال سے بے نیاز نہیں ہوا، یہ پاسِ ادب بھی تھا اور شاعرِ اوّل کے اعلیٰ فنی کمال کا اعتراف بھی، اور توافقِ لسانی کے تحت بھی یہ ناگزیر تھا۔

یہی وجہ ہے کہ خاور کی کاوش کو ہم INSPIRED PARAPHRASE نہیں کہہ سکتے، بلکہ اسے نقشِ اوّل کا عکس بزنگِ دیگر یا بزبانِ دیگر کہا جاسکتا ہے۔ جہاں خیام کا مترجم فٹزجیرلڈ نقشِ اوّل سے باہر نکل کر پھیل جانے کی کوشش کرتا رہا، وہاں جاوید نامہ کا مترجم نقشِ اول کے زیادہ قریب رہنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ اور حالات کا تقاضا یہی ہے۔

تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بالآخر ہمیں دیکھنا یہ پڑے گا کہ خاور نے اقبال کے فارسی شعر کو باندازِ اقبال اپنے اردو شعر میں ڈھالنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اصل سے وفاداری کا حق کس طرح ادا کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اصل اور ترجمے کے مقابلے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اب جاوید نامہ اور اس کے ترجمے کے چند اقتباسات آمنے سامنے نقل کئے جارہے ہیں۔

جاوید نامہ	ترجمہ جاوید نامہ
ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور	ڈھونڈتے ہیں ہم تجھے اور تو کہیں نظروں سے دور
نے غلط، ما کور و تو اندر حضور	یوں نہیں، ہم بے بصر ہیں اور تو سر تا پا حضور
یا کشا ایں پردۂ اسرار را	یا ہٹا دے سامنے سے پردۂ اسرار کو
یا بگیر ایں جانِ بے دیدار را	یا اٹھا لے اے خدا اس جانِ بے دیدار کو

نخلِ فکرم ناامید از برگ و بر	برگ و بر سے نا امید افکار کا میرے نہال
یا تبر بفرست یا بادِ سحر	یا اسے شاداب کر دے یا تبر سے کاٹ ڈال
عقل داری ہم جنونے دہ مرا	تو نے بخشی ہے خرد اب بخشدے ذوقِ جنوں
رہ بجذب اندرونے دہ مرا	جذبِ باطن کے سرور و کیف کا مشتاق ہوں
علم در اندیشہ می گیرد مقام	علم کا مسکن ہے پنہاں خلوتِ افکار میں
عشق را کاشانہ قلبِ لاینام	عشق کا کاشانۂ روشن دلِ بیدار میں
علم تا از عشق برخوردار نیست	علم کو گر عشق سے حاصل برومندی نہیں
جز تماشا خانۂ افکار نیست	جز تماشا خانۂ افکار وہ کچھ بھی نہیں

فارسی اور اردو متن کی مماثلتیں ظاہر ہیں اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ خاورؔ نے اقبالؔ کے بالکل قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔

خاورؔ کی نقش تراشی کی ایک امتحان گاہ فارسی غزل کا نقشِ نو ہے۔ یوں میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ خاورؔ غزل کا ترجمہ نہ کرتے تو اچھا کرتے، یعنی غزل کو جوں کا توں فارسی ہی میں رہنے دیتے تو تاثر زیادہ گہرا ہوتا، کیونکہ فکر کے مقابلے میں جذبے کی زبان کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا زیادہ مشکل ہے، خصوصاً اس طریق کار میں جو خاورؔ نے اپنے ترجمے میں اختیار کیا ہے تاہم اس سے یکرنگی و یکسانی کا فائدہ ضرور ہوا ہے۔ اس لحاظ سے غزل کو نئے لباس میں پیش کرنے کی کوشش بڑی ہمت و مردانگی کی بات ہے۔ اگرچہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا نقش

کمزور ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کی غزل کو پہلے پڑھئے اس کے بعد خاورؔ کے نقشِ ثانی کو دیکھئے تاہم درجِ ذیل غزل میں شاعر کی قوتِ اختراع و انتقالِ معانی کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ غزل کی ترسیلِ معانی میں بھی مردانہ وار بڑھا ہے۔

نوائے طاہرہ	ترجمہ
گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو	ہو اگر اتفاقِ دید چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو
شرحِ دھم غم ترا نکتہ بہ نکتہ، مُو بمُو	شرحِ غم نہاں کروں، نکتہ بہ نکتہ مُو بمُو
از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام	دیدِ جمال کے لئے، گھوموں پھروں صبا کی طرح
خانہ بخانہ در بہ در کوچہ بہ کوچہ کُو بہ کُو	خانہ بخانہ در بہ در کوچہ بکوچہ کُو بہ کُو
می رود از فراق تو خونِ دل از دو دیدہ ام	تیرے فراق میں رواں، آنکھوں کی راہ خونِ دل
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جُو بجُو!	دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جُو بہ جُو!
مہر ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں	اپنی قماشِ جاں میں یوں، شوق ترا سمو لیا
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پُو بہ پُو	رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ، تار بہ تار پُو بہ پُو!
دردِ دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا	طاہرہ دل میں گھوم کر کچھ بھی نہ دیکھا جز ترے
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تُو بہ تُو	صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تُو بہ تُو!

خاورؔ کی قوتِ ایجاد کے روشن ثبوت ان مواقع کی نظم نگاری میں ملتے ہیں جہاں اس نے ہندی حکماء و شعراء کے اقوال کو اردو نظم میں پیش کیا ہے۔ اس نے ایسے موقعوں پر ہندو فلسفے کی اصطلاحات

بعینہٖ ترجمے میں جذب کردی ہیں ۔ یہ بات اصل فارسی میں اوپری اور نامانوس ہوتی ۔ مگر اردو چونکہ اپنی سرشت کے اعتبار سے سنسکرت ہندی کے ماحول سے مانوس ہے، اسلئے اردو ترجمے میں یہ اختراع مانوس نظر آتی ہے ۔

فلکِ قمر میں جہاں دوست (وشوامتر) کے اپدیش (بصورت مکالمہ) آتے ہیں، ان میں رومی سے گفتگو کرتے ہوئے وشوامتر کہتے ہیں ۔

پورب استت اور نا استت ہی میں ہے الجھا رہا
وہ نہ ان انمول بھیدوں کی بھنک تک پا سکا
ہم کہ ہیں آکاش باسی کام اپنا دیکھنا
کل کے بارے میں نہیں پورب کے مجھ کو دوبدھا
قشمرود اک اونچا پربت پربتوں میں چاند کے
اس کی چوٹی پر کل اترا دیوتا آکاش سے
مت چھپا میں نے کہا ہم ساتھیوں سے من کی بات
شانت دھرنی میں چھپی ہے ایسی کیا اَن جانی بات؟

یہ ساری گفتگو ہندی سنسکرت آمیز ہے اور ہندو رشیوں کے حوالے سے نہایت ہی مناسب معلوم ہوتی ہے ۔ بھرتری ہری کے اپدیش بھی اسی نوع کے ہیں۔ ان میں بھی حکیمانہ زبان ہندوانہ ہے۔

شاعری میں عموماً اور ترجمے میں خصوصاً "ورشن" VERSION کو بہتر بنانے کی رسم از ابتدا چلتی آتی ہے۔ جن لوگوں نے الیڈ، اڈیسی، انیڈ وغیرہ کے انگریزی ترجمے کئے ہیں ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان میں سے بعض نے بیس بیس مرتبہ اپنے "ورشن" تبدیل کئے، خود فٹز جیرلڈ کے INSPIRED PARAPHRASE میں بار بار کی اصلاحات و ترمیمات موجود ہیں۔ میں نے خادر کے ترجمے کے قلمی مسودے میں کاوش کی بیسیوں مثالیں دیکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ورشن کو بہتر اور خوبتر جاننے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ اسے شاعر کی دیانت سمجھنا چاہیئے کہ وہ پہلی سوچ پر قانع نہیں ہوا اس کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اقبال کی حکیمانہ فارسی تراکیب و کنایات کو اردو کا ایسا لباس پہنایا جا سکے جس سے فارسی کا شکوہ قائم رہے اور اردو کے وہ پیرایہ ہائے بیان اختیار کئے جائیں جو پُرشان و شکوہ فارسی کے پہلو میں پھسپھسے معلوم نہ ہوں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ خادر ہر خیال کے لئے ایک موزوں قماش تیار کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

جیسا کہ شروع میں بیان ہوا ہے بعض لوگ ترجمہ کرنے والوں کی کاوشوں کو ایک کمتر سلسلۂ عمل سمجھتے ہیں، مگر ان کا یہ خیال درست نہیں، کیونکہ درحقیقت ترجمے کا عمل شاعر کے عمل سے کسی طرح بھی کم رتبہ نہیں ہوتا۔ اگر ترجمے نہ ہوتے تو انسانیت جغرافیائی قیدخانوں میں بند ہو کر رہ جاتی، اور انسان کے ایک گروہ کے ذہنی کارنامے دوسرے گروہوں تک کبھی نہ پہنچ پاتے۔ ترجمہ دراصل توسیع علم ہی کا ذریعہ نہیں وحدتِ انسانی کا بھی احساس دلاتا ہے۔ انہی وجوہ سے دنیا

کے علم پرستوں کی طرح انسانیت نوازوں نے بھی ترجمے میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ جس سے دنیا کے ہر ملک میں نئی ادبی تحریکوں نے جنم لیا، اسی لئے ایذرا پاونڈ نے ایک موقع پہ کہا تھا:

"ادبی تخلیق کا عظیم دور ہمیشہ ترجمے کا بھی عظیم دور ہوتا ہے۔ یا پھر نتیجے کے طور پہ فوراً بعد میں پیدا ہوتا ہے۔"

اس مقولے کا پہلا حصہ درست ہو یا نہ ہو کم از کم دوسرے حصے کے صحیح ہونے میں کچھ کلام نہیں۔

اردو زبان اگرچہ عظیم اور یکتا تخلیقات سے خالی نہیں مگر اس میں عظیم نشاۃ الثانیہ کے ظہور کے لئے جتنے بھی عمدہ ترجمے ہوں اتنا ہی اردو کے حق میں مفید ہوگا، اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ غالبؔ کے باقی ترجموں کی طرح یہ ترجمہ بھی اس علمی انقلاب کے ظہور میں موثر معاون ثابت ہوگا۔

مقدمہ

یہ روح کی مادے پر فتح کا جشن ہے، یہ زمان و مکان کی تسخیر کا منشور ہے۔ اس میں انسان چار سُو کی قید سے نکل کر لامکاں سے ہم آہنگ ہو کر کن فیکون کی سرگوشیاں کرتا ہے۔

(عبدالعزیز خالدؔ)

ابتداء میں اکثر فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کا کچھ حصہ بروئے کار نہیں آتا رفتہ رفتہ جوں جوں ان کے طبعی جوہر نشو و نما پا کر بلوغ کی حد تک پہنچتے جاتے ہیں، ان کے قویٰ یکے بعد دیگرے بیدار ہو کر شعر و فن کے ساتھ ترکیب و اختلاط کے نتیجے میں بار آور ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی فطرت بہ تمام و کمال یکرنگ و یک آہنگ ہو جاتی ہے اور ان کی مکمل شخصیت تخلیق کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے۔ جذب و فکر، بذلہ سنجی، دردمندی، شدت و ملائمت، علم و فراست، سب کے سب تخیل کے ممد و معاون بن کر سرگرم کار ہوتے ہیں۔

(ایڈورڈ ڈاؤڈن)

"جاوید نامہ" اقبال کا خوابِ بیداری ہے، خواہ یہ خواب غیر شعوری ہو یا شعوری طور پہ غور و فکر کا نتیجہ ہو، کیونکہ یہ اس الہام سے طلوع ہوتا ہے جو اپنے ساتھ ایک خاص کیف لاتا ہے۔ کیفِ دوام۔ حسن ایک بار پھر آئینۂ حق بنتا ہے اور ہم اس میں اقبال ہی کا خواب نہیں دیکھتے بلکہ اپنے خوابوں کا عکس بھی پاتے ہیں۔ یہ حق اور حسن

دونوں کا نقطۂ عروج ہے۔

اقبال کی تمام تصنیفات ایسی بلند سطح پر واقع ہیں جہاں فکر و فن افق بوس ہو کر نئے نئے مناظر تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں "جاوید نامہ" سب سے بلند مقام پر واقع ہے۔ یہ ان کا "غزل الغزلات" ہے جس میں ان کے فکر و نظر اور ہنر و فن کے تمام جوہر پوری فراوانی سے جلوہ گر ہیں۔ بعینہٖ اس رباب کی طرح جس کی نوا آفرینیوں کا طلسماتی نقشہ قلم کے آخر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ان گوناگوں عناصر کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کے قالب میں سموئے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ وہ طرح نو ہے جو اس میں غیر معمولی جاذبیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے وسیع پردوں پر رواں دواں خیالی و حقیقی پیکر، کوائف و حالات اور مناظر و مرایا کا بے پایاں سلسلہ دیدہ و دل کو اپنے طلسم میں اسیر کر لیتا ہے۔ یہی تصویری و افسانوی کیفیت ہے جو اس کو اقبال کی تصنیفات میں سب سے دلچسپ بنا دیتی ہے، اور فکر و بیان اور رموز و اشارات کی شکل میں نت نیا تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شائع ہوتے ہی قبول عام حاصل کر لیا اور اسے "شاہنامہ مثنوی معنوی" گلستاں و بوستاں اور دیوانِ حافظ کے دوش بدوش جگہ دی گئی۔ اس کا شمار ان امہات ادب میں ہے جو تمام نوع انسان کا گراں قدر معنوی سرمایہ ہیں۔ یہ اس سنہری سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے جسے اقبال کی احسن التصانیف قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

جاوید نامہ ایک ایسے روحانی سفر کی روداد ہے جو خیالی بھی ہے اور حقیقی بھی اور جو شعر و فن اور فلسفہ و حکمت کے گوناں گوں مدارج سے گذر کر ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں اس کے افق لامتناہی افقوں سے ہمکنار ہو جاتے ہیں، اور ہم حیات و کائنات کی ابدی حقیقتوں کو محسوس و مرئی شکل میں جلوہ گر پاتے ہیں۔

یہی اس کے عنوان کا تقاضا ہے اور منتہائے مقصود بھی۔

نظم کی نوعیت اور اٹھان متقاضی ہے کہ اس کی جاودانی حقائق سے نسبت اولیٰ ہی کو مقدم قرار دیا جائے۔ شاعر کے فرزند جاوید اقبال سے اسکی مناسبت بعید ہے۔ کیونکہ یہ اقبال کی بلند فطرت اور نظم کے حقیقی منشا کے خلاف ہے۔ اگر جاوید سے خطاب بھی کیا گیا ہے تو نژاد نو کے نمائندہ کی حیثیت سے، کیونکہ اقبال کی امیدیں بڑی حد تک نئی نسل ہی سے وابستہ ہیں جس کی صراحت انہوں نے خود ہی کردی ہے:-

من کہ نومیدم ز پیران کہن   در جہاں از نسلِ نو دارم سخن

لہٰذا نظم کے "بیرونِ کتاب" حصہ میں جاوید سے تخاطب درحقیقت نژاد نو سے تخاطب ہے۔ اور جاوید کی مناسبت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ "جاوید نامہ" بذاتِ خود وسیع تر مقاصد کا حامل ہے جن کے باعث اسکی تخلیق عمل میں آئی۔ اس کا خطاب تمام عالم انسانیت سے ہے۔ اور اس میں انہی بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے جو تمام نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت اقبال کی ہر تصنیف بجائے خود "جاوید نامہ" ہے۔ کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک مشاہدۂ حق ہی کا عنصر کارفرما ہے۔

یہ طے کرنے کے بعد کہ جاوید نامہ کی بنا کسی اہم تصور پر ہے، ہم اسکی اپنے اپنے فکر و نظر کے مطابق توجیہہ کر سکتے ہیں۔ اقبال نے خود اسے سیاحتِ علوی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ محض عالم بالا کی شوقیہ سیاحت نہیں۔ اس کی تہہ میں کوئی اور مقصد ہے۔ خواہ وہ زمینی ہو یا آسمانی جیسی بھی اقبال کے تصورات کے مطابق اس کی تعبیر کی جائے۔ اگر اس کا مقصد حیات انسانی کی احسن تنظیم اور خود انسان کی تربیت ہے تو یہ سفر فی الحقیقت زمینی ہوگا جس کا سروکار تمام تر دنیاوی معاملات سے ہے۔ اقبال کے نزدیک آسمانی یا الہیاتی امور ارضی معاملات

ہی کی تہذیب ہیں۔ البتہ اس تہذیب کے بعد حیاتِ انسانی جو صورت اختیار کرتی ہے اس کے بارے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ آیا یہ تمام تر الہیاتی ہے یا نیم الہیاتی یا نیم انسانی کیونکہ اقبال کی وفاداریاں زمین و آسمان دونوں سے ہیں۔

جیمس بی پرائر نے "جاوید نامہ" کو اسلامی تصور ہی کی توضیح قرار دیا ہے[1]۔ اور عزیز احمد کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جب اقبال نثر میں اسلامی تصور کے بموجب برصغیر پاک و ہند میں آزاد و خود مختار اسلامی مملکت کا خاکہ پیش کر چکے تو پھر انہوں نے یہی خاکہ جاوید نامہ میں شاعرانہ طور پیش کیا۔ دراصل اقبال ملتِ اسلامیہ کا تصور قبل ازیں بارہا مختلف مقامات پر پیش کر چکے تھے۔ تاہم فاضل نقاد نے اقبال کے تصورِ ملی ہی کو جاوید نامہ کا موضوع ٹھہرا کر اس کے بعض اشعار کو خصوصی معنی عطا کئے ہیں۔ مثلاً

نقشِ حق تا در جہاں گردد تمام　　　　می شود دیدارِ حق دیدارِ عام

آربری نے عوام کا ترجمہ عوام الناس کیا ہے۔ اس کے برعکس پرائر نے اس کو عامی، ہر انسان، مبتدی اور جنتا قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں مصنف کا مدعا یہ ہے کہ عام و خاص سب حق آشنا ہو جائیں گے جیساکہ اس اردو مصرعے سے ظاہر ہے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

ظاہر ہے کہ جب ملت کا تصور خود اسلام کا اساسی تصور ہے تو اسے لامحالہ اقبال کے یہاں بھی بنیادی حیثیت حاصل ہوگی، لیکن محض اس حد تک کہ یہ اس کا لازمی جزیا نتیجہ ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

[1] اقبال ریویو جولائی، ستمبر ۱۹۷۴ء

مذہب بالخصوص اسلام اور عرفانیات دونوں نکرِ اقبال کا مرکز و محور ہیں، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کلیۃً انہی میں محصور ہیں۔ ان کا ذوق و شوق اور جدید حالات سے متاثر شعور بعض اوقات ان سے متجاوز ہو کر دوسری جولاں گاہیں بھی تلاش کر لیتا ہے۔ وہ مذہب کو اسی حد تک روا رکھتے ہیں جہاں تک یہ کشمکشِ حیات میں کارآمد ثابت ہو۔ وہ روایات کی پیروی اور تقلید کو خودکشی تصور کرتے ہیں اور ان کے برعکس تخلیق اور تحقیق ہی کو لازمۂ حیات خیال کرتے ہیں جس سے ہر زندہ انسان کو بہرہ ور ہونا چاہیئے:

ہر کہ او را لذتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

اقبال کے نزدیک سوزِ حیات اور حقیقی ایمان ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ ان کا ضابطہ تمام تر ضابطۂ حیات اور جذبۂ عشق ہے جسے وہ سیر دوام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں مقصودِ تسخیرِ فطرت ہو وہاں ہر اقدام بجا ہے۔ اور تقلید اس کے لئے کامل طور پر کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر اس طرح روایتی مذہب میں کچھ شرکِ خفی بھی شامل ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ:

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازۂ آید بروں

شرط صرف جنوں کی ہے خواہ اسکی نوعیت کچھ ہی ہو، چنانچہ اقبال بھی غالب کے اس مشرب سے ہم آہنگ ہیں کہ:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اور یہ کہ:

آدمیت احترامِ آدمی است

اسی لئے "جاوید نامہ" میں جہاد کی بہ نسبت رواداری پر زیادہ زور ہے۔

جہاں تک عرفان و سریان اور کشف و الہام کا تعلق ہے اقبال کی دلچسپی محض اکتساب کی حد تک ہے۔ وہ وہبی صلاحیتیں جو از خود سیر و سلوک میں انہماک پیدا کرتی ہیں ان کے یہاں بڑی حد تک مفقود ہیں۔ اقبال کو فلسفہ و حکمت سے غیر معمولی رغبت تھی، وہ اپنے ہی الفاظ میں تمام عمر درس فلسفہ دیتے رہے، لیکن ان کا ذہن کبھی اسکی چار دیواری میں مقید نہیں ہوا۔ مابعد الطبیعیات ان کے لئے محض نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

اقبال کے نظامِ فکر میں تین چیزیں رکنِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہیں؛ تسخیر کائنات، اس کا ذریعہ عشق اور ماحصل معراج۔ یہ سب "جاوید نامہ" کے مہماتِ امور میں داخل ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اس کا نفسِ ناطقہ کہا جا سکے۔ یہ سب ایک ہی معاملہ کے مختلف پہلو ہیں جو ایکدوسرے سے مربوط ہیں اور براہ راست نظم کا موضوع نہیں بلکہ اس سے نتیجۃً اخذ ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے ممکناتِ ارتقا پر بحث کی جائے تو یہ لازماً اس کے مقدر پر بھی حاوی ہو گا جسے بعض نے جاوید نامہ کا موضوع خاص قرار دیا ہے۔

معراج کا تصور وہ فعال عنصر ہے جو رفتہ رفتہ اجاگر ہو کر دیگر تعلقات کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ یہ تصور ساری نظم پر ادل تا آخر اسقدر طاری و ساری ہے کہ اسے نظم کی روحِ رواں قرار دینا بے جا نہ ہو گا۔ ابتدا ہی میں رومی کی زبانی اسرارِ معراج کی توضیح اس کی شاہد ہے۔ اور آخر میں زندہ رود کا "حضور" تک تن تنہا سفر اس کی انتہا ہے۔ مدعا معراجِ نبوی کی عکاسی نہیں بلکہ نفسِ معراج کو تمثیلاً اجاگر کرنا ہے۔ اس کے

باوجود نظم کو بالواسطہ یا بلاواسطہ معراج ہی پر منحصر کرنا درست نہیں کیونکہ اس سے اس کے تعبیری امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معراج کے پردہ میں حقیقی مقصد ان اصول و آئین کی توضیح ہے جن کے مطابق بہتر زندگی بسر کی جاسکتی - اور انسان مشیت الٰہی کی تکمیل میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود معراج کی مرکزی حیثیت برقرار رہتی ہے۔ یہ وہ نصب العین ہے جس سے فرد اور جماعت دونوں کی انتہائی تکمیل مقصود ہے، یعنی فرد کی نشوونما حد کمال کو پہنچ جائے جو رومی اور اقبال کے الفاظ میں منزل کبریا ہے، اور جہاں پہنچ کر انسان اخلاق و صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر فرد کا کمال صرف یہ ہے کہ اسکی انا ذاتِ باری کی انائے کبیر سے ہمکنار ہو جائے۔ اسی طرح اجتماعی شرف یہ ہے کہ جماعت صالح اور فعال معاشرہ کے سانچے میں ڈھل جائے، اور یوں فرد و جماعت ایکدوسرے کے دست بدست اور دوش بدوش اسطرح گامزن ہوں کہ وہ عروج و ترقی کے تمام مقامات سر کرتے چلے جائیں۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اگر نقشِ قرآں جسے اقبال نے از سرِ نو اجاگر کیا ہے نقشِ جاوداں بن جائے تو انسانی مقدر کے ارتقائے مسلسل کے اسباب خود بخود فراہم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ منازل فلکی طے کرتا ہوا انسانیت کے برجِ شرف تک رسا ہو سکتا ہے۔ یہ عروج در حقیقت معراج نبوی ہی کا نقشِ ثانی ہے، یعنی اس کا اہم وضع معراج انسانی جس سے آنی میں جاودانی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی بنا پر خود "جاوید نامہ" بھی جس میں معراج کا حقیقی تصور فراہم کیا گیا ہے ایسی ہی تابِ دوام کا

حامل ہے۔ یہ ارتقا اور استکمال کا وہ جاودانی ڈرامہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ پہنائے مکان پر متمثل ہوتا رہے گا۔ بنا بریں اسکی کوئی بھی محض مذہبی، سیاسی، اخلاقی تعبیر یکرخہ اور ناکافی ہوگی۔

جاوید نامہ کی نوعیت خالصاً حیاتیاتی اور نامیاتی ہے۔ انفس و آفاق کے اعماق سے ابھرتی ہوئی۔ اس کی نمود درونِ کائنات سے ہے، جیسے اس میں ضمیر کن فکاں کا نفس ناطقہ کارفرما ہو۔ ایک طرف عالمِ آدم اور حق اور دوسری طرف خلق و ہدایت سبھی اشتراک کلی کے ساتھ ارتقا پذیر ہو کر مشیت الٰہی اور مقدرِ انسانی کی تشکیل کرتے ہیں اور انسان و کائنات اس نقطۂ عروج تک پہنچنے میں کوشاں ہوتے ہیں جو غایت الغایات ہے۔ اس طرح یہ کائنات کوئی جامد مسلسلہ نہیں جیسا کہ جدید سائنسدانوں کا خیال ہے، بلکہ "خلیفۃ الارض انسان" کے مقدر کے سلسلۂ لامتناہی کا کائناتی جلوس ہے جس میں ہر گام صدائے کن فیکون گوش زد ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے دانتے کی ڈیوائن کومیڈی اور اقبال کے "جاوید نامہ" ہی کی تخصیص نہیں بلکہ ہر تصنیف جس کا سروکار حقائق و معارف یا اسرار و رموز سے ہو حقیقتہً سرمدی ہے۔ چنانچہ مثنوی مولانا روم کو مثنوی معنوی قرار دینے کا مدعا بھی یہی ہے۔ اگر وہ قرآن در زبانِ پہلوی ہے تو "جاوید نامہ" اور اقبال کی تمام تصنیفات قرآن علی القرآن کی مصداق ہیں اور اس توضیح بر توضیح کا نتیجہ وہ قلبِ ماہیت ہے جو فکرِ اقبال کو بجائے خود منفرد حیثیت عطا کرتی ہے۔ جیسے یہ تصور محرکِ اولیٰ بھی ہے اور محرکِ اخریٰ بھی، اپنے عہد کی رو سے آخر الزمانی بھی اور اجتہادی بھی۔ لامحالہ اس کے اثرات بھی متوازی و مماثل ہوں گے۔ یعنی جو حرکت آفریں موثرات و ممکنات اسلام کی روحِ رواں تھے اُنہی سے اقبال کی فکرِ مجددہ بھی مملو ہے۔

ان کے افکار کی تمام تر خصوصیت تخلیق ہے جو تحقیق سے بالاتر اور اس کو محیط ہی نہیں بلکہ اسکی بر اثر بھی ہے، یعنی اقبال کا مقصد خود حیات ہے نہ کہ اسکی سطحی علامات جن کی تحقیر انہوں نے "موئینہ بر بر کردی و بے ذوق تپیدی" میں کی ہے۔ ان کا زور باطن پہ ہے نہ کہ ظاہر پہ:

فیضے کہ من از دل طلبم بوئے کباب است!

خود "مثنوی معنوی" کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ فیہہ ما فیہہ ہو۔ عین حیات نہ کہ اس کے خوارج۔ یعنی معنیٰ، در معنیٰ، در معنیٰ ہے

دید آں باشد کہ دید دوست است
آدمی دید است باقی پوست است

علیٰ ہذا اگر ہم دیگر فن پاروں پر بھی نظر ڈالیں تو ان کو آیاتِ سرمدی یا جاودانی نقوش ہی سے تعبیر کیا جائے گا مثلاً ورڈز ورتھ کی نظم "ODE TO THE INTIMATIONS OF IMMORTALITY" شعرائے ایران میں خاقانی کا ابتدائی تخلص حقائقی تھا، اسی بنا پر اسے خلاق المعانی قرار دیا گیا۔ اقبال خود سرود سرمدی اور سرود جاودانہ جیسی تراکیب بار بار استعمال کرتے ہیں۔ دانتے کے طربیۂ خداوندی کے ساتھ ڈیوائن کا اضافہ بھی قارئین کے اس وہبی احساس کا نتیجہ تھا کہ اسکی حیثیت ابدی ہے۔ ممکن ہے خود اقبال نے کومیڈی سے بھی تاثر قبول کیا ہو، اور مغرب کی نوائے سرمدی کا جواب مشرق کے نامۂ جاوید سے دیا ہو۔ یہاں جواب سے مراد اسکی ہم وضع نظم ہے جو اس کی مد مقابل ہے نہ کہ تقلیدی کوشش: اقبال نے ایسی کئی نظمیں لکھی ہیں، چنانچہ "گلشن راز جدید" کو "جواب نامۂ محمود" قرار دیا گیا ہے۔ "زبور عجم" عبرانی زبور کے مقابلے میں ہے اور "پیام مشرق" تو بر ملا گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب ہے۔ اقبال کی

یہ تمام تصنیفات مثیل ہیں نہ کہ صدائے باز گشت۔ "ڈیوائن کومیڈی" کے سلسلے میں اقبال کے ندیم خاص چوہدری محمد حسین نے بالتصریح بیان کیا ہے کہ موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں جب پروفیسر آسین کی عہد آفریں تصنیف یکایک تحقیق کے افق پر نمودار ہوئی تو اس نے یورپ کے ادبی حلقوں میں تہلکہ پیدا کر دیا، اس لئے اقبال کا حساس ذہن بھی اس انکشاف سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جو اسلام کے عالمگیر فیضان اور تاریخ میں انقلاب آفریں کردار کی بین دلیل تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ انکشاف کومیڈی کی طرف زیادہ توجہ اور اس کے جواب میں نغمۂ سرمدی لکھنے کا محرک ہوا ہے تاہم اس سلسلہ میں احتیاط لازم ہے کہ جاوید نامہ کا دائرہ مغرب کے خلاف مشرق اور نصرانیت کے خلاف اسلام تک محدود نہ کیا جائے، کیونکہ اس کے جاوید ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا سروکار مشرق و مغرب دونوں سے ہو۔ اگر معراج کا مدعا تمام انسانیت کا عروج ہے تو ظاہر ہے "جاوید نامہ" جس کا مرکزی تصور معراج ہے اسلام یا مشرق تک محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کا اطلاق تمام عام انسانیت پر ہے۔ اقبال نے خود ہی اسکی وضاحت کر دی ہے :

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیر او گردوں شود روزے

یہاں کوکبِ تقدیر کی عمومیت بخوبی واضح ہے جو اس کے خوابِ کاملیت کی درخشندہ و تابندہ تعبیر ہے۔

انسان نے کاملیت کا خواب کب نہیں دیکھا؟ ہبوطِ آدم حقیقت ہو یا افسانہ جب سے انسان نے دنیائے ہست و بود پر آنکھ وا کی ہے زمین پر قیام پذیر ہوتے ہوئے اس کی نظر اوجِ آسمان پر رہی ہے، اسے اپنی پستی کا احساس رہا ہے جس کے لئے اس نے سفلی و علوی، زمینی و آسمانی کی اصطلاحیں

بھی تراشی ہیں اور نظریات بھی قائم کئے ہیں یہاں تک کہ تمام الہیاتی فلسفوں کی بنیاد ہی تمام تر اس امتیاز پر ہے۔ چنانچہ فلسفۂ اشراق کے بانی شیخ اکبر نے نور کے مراتب قائم کئے اور کہا کہ بالائی نور کو زیریں نور پہ غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ زیریں نور میں ذوق و شوق طبعاً مضمر ہے۔ تاکہ وہ ارفع و اعلیٰ نور کو پالے۔ یہی وہ نورالانوار ہے جو تجلی بالذات ہوتے ہوئے تمام تجلیات کا سرچشمہ ہے۔

اس طرح رفعت کی تمنا گلِ آدم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرتِ آدم بہشت سے باہر نکلے تو ان کی نظر پھر بھی بہشت ہی پر رہی جو ہر اعتبار سے مثالی دنیا تھی۔ وہ زمین پر قدم رکھتے ہوئے آسمان کے خواب دیکھنے لگے۔ آج تک یہ خواب ہر انسان کا خواب ہے۔ حافظ کے نزدیک یہ "نشیمنِ قدس" ہے، تو صائب کے الفاظ میں "پاکیزہ گلشن":

چوں ازاں پاکیزہ گلشن یاد می آید مرا

ورڈز ورتھ اسے کاشانۂ ابدی تصور کرتا ہے۔ یہ خواب بہشت ہی کا خواب نہیں۔ ہستیٔ کبریٰ یا حقیقتِ اولیٰ سے منقطع ہو کر اسکی باز دید اور بازیافت کا خواب بھی ہے، ایک مثالی زندگی سے ہمکنار ہونے کی تمنا جو ہر زمانے میں انسانی فکر اور ماحول کی حدِ وسعت کے مطابق کوئی نہ کوئی روپ دھارتی رہی ہے:

منتظر اک بلندی پہ اور ہم بنا سکتے

حقیقتِ اولیٰ کی بازیافت اور اس کے ساتھ ہم آہنگی کی کوشش بھی ایک طویل داستان ہے۔ یہ ایک خواب ہے اور ضروری نہیں کہ یہ خواب الوہی ہو۔ اسکی نوعیت بقدرِ نظر یا بقدرِ احوال ہے۔ جاپان کے شامان یا افریقی قبائل کا تصور تمام تر بہشت گمشدہ پر مبنی ہے جس میں ماہر حاضرات "موتو ان تمو تو" ہی کے تحت عالم

ETERNAL HOME

مادی سے گذر کر عالمِ ارواح کیساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے[1] اور تمام کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی تصور ان اقوام کے مخصوص اساطیر کا باعث ہوا۔ یہ بھی درحقیقت دوام ہی کا تصور یا لائحۂ عمل ہے۔ آسمان تک رسائی کا ذریعہ کوئی شجر انگور کی بیل یا زینہ ہوتا ہے جس کے آثار معروف ادیان میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں کبھی بیخودی یا استغراق اور دنیا سے انقطاع کو دخل ہے اور اسکی نوعیت سرتاسر سریانی ہے۔ سالک یہاں بھی زمان و مکان اور آب و گل کی قیود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ معروف مذاہب میں فردوسِ گم شدہ اور اس سے علاقۂ روحانی کا تصور کس طرح داخل ہوا جو ذہنِ انسانی پہ آج تک مسلط ہے۔

اس قسم کے اندازِ فکر کے آثار چین، ایران وغیرہ کئی ممالک میں دستیاب ہوتے ہیں۔ علم کیمیا[2] جس کا مولد و منشا جدید تحقیق کی رُو سے چین قرار پاتا ہے درحقیقت اسی اندازِ فکر کا نتیجہ تھا جس میں زمین و آسمان کو متحد تصور کیا جاتا تھا اور جس کی جھلک ہمیں ہندوستان کے برھمانڈ میں دکھائی دیتی ہے۔ بقول دانتے علم الکیمیا درحقیقت کائنات ہی کی نقالی کی کوشش تھی۔ برھمانڈ میں دھرتی اور آکاش (کیونکہ زمانۂ ماضی میں زمین کے پست اور آسمان کے بلند ہونے کا تصور ناگزیر تھا) انڈے کے بالائی اور زیریں خول تھے، گویا کیمیا کائنات کی وحدت اور اکسیر تلاش دوام ہی کی یادگار ہیں۔ مقصود بہرحال حیاتِ ابدی

[1] یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ قدیم خلا نورد، سرمستانہ جذب و کیف کی وادیوں میں سیر کر کے عالمِ بالا کی خبر لاتے تھے انکی پرواز سلسلۃ البروج کے ربانی و ملاغوتی طبقات میں تھی جہاں وہ نقل و حرکت کے دوران میں ارواح اور پراسرار حاضرات سے ملاقات کرتے تھے۔ [2] ملاحظہ ہو مقالہ بعنوان (CREATION: ITS NATURE AND IMITATION IN ALCHEMY مطبوعہ اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۸ء از الیس مہدی حسن)

ہے۔ دیگر اہلِ دین کی طرح غالب کی تمنا اس کے سوا اور کیا تھی کہ:

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس

از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

ہبوط کا لازمی نتیجہ صعود ہے۔ جب دنیا و ما فیہا کے حادث اور خود انسان کے ناپائیدار عضو ضعیف ہونے کا احساس پیدا ہو تو لازم ہے کہ ایک مخصوص زاویۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات و کائنات بھی پیدا ہو انسان اپنے عروج کے خواب دیکھے، ان کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے نظریے وضع کرے اور حصولِ کار کے طریقے اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ شائستہ مذاہب میں من و تو کا رشتہ بندہ و مولا کا رشتہ بن جاتا ہے اور اس کے مطابق سلوک یا ارتقائے روحانی کے طریقے مقرر ہوتے ہیں۔ یہ بیک وقت عرفانِ خود بھی ہے اور عرفانِ حق بھی من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔ ظاہر ہے کہ اس کی ارفع ترین شکل معراج ہے۔ یعنی نفسِ انسانی کا انتہائی نقطۂ عروج یہی کاملِ انسانیت کا آخری درجہ ارتقاء اور منتہی المنتہیٰ ہے جس پر تمام روحانیین کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ تاریخ مغرب پر نظر ڈالی جائے تو ارسطو اور افلاطون سے لیکر کارل مارکس تک گوناگوں شکلوں میں انسانیت کاملہ کا تصور دکھائی دیگا جس نے وقتاً فوقتاً اطوبیا (UTOPIA) کی شکل اختیار کی ہے۔ قدیم و جدید حکما و عرفا اور شعراء برابر انسانیت کاملہ کے تصور کی نشان دہی کرتے رہے ہیں۔ دانتے، ڈی لارنس، اسپنسر، جان بنیان اور ملٹن نے نصرانی تصور کے مطابق مثالی انسان یا شہسوار کی عکاسی کی ہے اور اس کی تمثیلیں اور رویا پیش کئے ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جس کے کتنے ہی رہ نورد ہیں۔ انگریزی ادب میں (HOLY GRAIL) کا اسطورہ دکھائی دیتا

ہے۔ جو ایک نقطۂ عروج کی طرف بڑھنے کی علامت ہے۔ یہود و نصاریٰ میں بھی جنت کی تمنا نمایاں حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ اشعیاہ اور ورجل دونوں نے اس کی تمنا ظاہر کی ہے۔

خوابوں کا رخ ہمیشہ مستقبل ہی کی طرف نہیں ہوتا بعض اوقات وہ پیچھے بھی پلٹ جاتا ہے اور خواب تمام نوع انسان یا کسی فرد کی ذاتی یا نسلی داستان دہراتے ہیں مثلاً: PIERS THE PLOWMAN کا وہ خواب جس میں صاحب رویا کو جان بنیان کی طرح حیرت انگیز مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ طامس مور کا "اطوبیٰ" اور ڈی لارس کا "رومانس آف دی روز" دو غیر معمولی رویا ہیں، ضروری نہیں کہ یہ حقیقی ہوں کیونکہ اس کا انحصار خواب بیں کی افتاد طبع اور مقصد پہ ہے۔ خواہ وہ کوئی حقیقی خواب یا رویا پیش کرے یا اسپنسر اور میلری کی طرح اسے تمثیل کی شکل عطا کرے۔

چین میں دوئی وزندک اور ایران قدیم میں ارداویراف کی علوی سیاحتیں نسبتہً معمولی حیثیت رکھتی ہیں، سیاحت علوی اور رویا کی ارفع ترین اور معروف ترین مثال پیغمبر اسلام کی معراج ہے جو حقیقی ہونے سے قطع نظر مادی و روحانی عروج کی علامت یا تمثیل کی حیثیت سے بھی نہایت دلآویز، بدیع خیال افروز، اثر انگیز اور مہتم بالشان بھی ہے اس میں بیک وقت روح اور تخیل کو مرتعش کرنے کے وسیع ترین ممکنات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معراج نبوی نے اسلامی حلقوں کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی حلقوں پر بھی زبردست اثر ڈالا اور دنیائے ثقافت میں ایک نئے آفاقی اور سحر کی اثر کا اضافہ کیا، معراج کا تصور اسلامی طرز حیات کا بنیادی تصور قرار پایا اور اعلیٰ روحانی مدارج تک رسائی جس کی انتہا انسان کامل تھا، ہر انسان کا مطمح نظر بن گیا۔ اسلامی اثرات کا یہ سیل رواں اچھل کر بیکراں ہوگیا، یہاں تک کہ صلیب و

ہلال کی شدید مناقشت کے باوجود یہ دنیائے نصرانیت میں بھی سرایت کر گیا۔

اسی کے متلازم اثرات تھے جنہوں نے مغرب کو نشاۃ الثانیہ عطا کی اور انہی کا ہمہ گیر نفوذ و استیلا تھا جس نے ہسپانیہ و اطالیہ اور لاطینی یورپ کو عرب و عجم بنا دیا۔ یعنی ایسے منطقے جن پر اسلامی اثرات بشدت تمام محیط ہوں۔ معراج نے بوقلموں عرفانی، روحانی، ثقافتی تانفرادی و اجتماعی معراجوں کا ایک طلسمی رجحان پیدا کر دیا، اسکی ساحرانہ دلآویزی اور تمثیلی و روحانی جاذبیت کے باعث تازہ بتازہ نو بنو تجربات اور واردات کے سوتے پھوٹ نکلے۔ اور ہر کہ دمہ اسی کے ذوق و شوق سے سرشار نظر آنے لگا چنانچہ جہاں جہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا وہاں پرواز شوق نے گوناگوں صورتیں اختیار کیں۔ بنیادی صورتیں دو تھیں بہ حقیقی اور افسانوی یا ادبی۔ حقیقی میں یا تو معراج نبوی کی کیفیت بیان کی جاتی یا ذاتی واردات اور مشاہدات کا ذکر ہوتا، اسکے برعکس افسانوی یا ادبی معراج لازمی طور پر تمثیلی یا بالواسطہ ہوتی، کیونکہ اس میں خواب کی حقیقت محض پیرایۂ اظہار کی تھی تاکہ اس کے ذریعے کوئی مقصد حاصل کیا جائے۔ خواب محض فرضی ہو ایک بہانہ جس سے پیرایۂ خواب کی دلچسپی، افسانوی حظ، آزادہ روی اور تخیل کی پرواز ایک جہانِ کیف و رنگ پیدا کر دے۔ اس میں خواب دیکھنے والا خواب نہیں دیکھتا بلکہ خواب بناتا ہے، بعینہٖ افسانوں کی طرح۔ اس کے مشاہدات ساختہ پرداختہ ہوتے ہیں، اس کی روح بذاتِ خود پیشکش میں سرایت نہیں کرتی اور آپ بیتی نہیں سناتی بلکہ داستان بیان کرتی ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ پیش کردہ خیالات اس کے خیالات نہیں ہوتے اور وہ ان کا قائل نہیں ہوتا۔ نہیں، خیالات اس کے اپنے ہی خیالات ہوتے ہیں اور وہ ان کو پُر زور احساس کے تحت ہی ادا کرتا ہے لیکن براہ راست کلام نہیں کرتا۔ اسکے لئے معکوس

راستہ اختیار کرتا ہے اور ایک لطیف پردہ درمیان رکھتے ہوئے جو کچھ کہتا ہے بزبانِ دیگراں کہتا ہے۔ یہ بالواسطہ پیرایہ خوشتر ہی نہیں بلکہ بدیع تر بھی ہے کیونکہ اس میں تخیل اور ذوق، معنی و بیان کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اس میں "سرِّ دلبراں" ہی نہیں بلکہ راوی کا اپنا سرِّ جاں بھی ہوتا ہے۔ اس طرح براہِ راست اظہار کی وہ شدت تو نہیں رہتی جسے غنائی پکار کہتے ہیں اور نہ وہ درونیت ہی رہتی ہے جو ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد کی مصداق ہو، لیکن اپنی جگہ یہ بھی ایک پیرایہ ہے۔ اور اگر احاسس حقیقی ہو تو اس کا اثر بھی معتد بہ حد تک لازمی ہے۔ یہ پیرایہ ظاہر ہے غیر خالص ہے۔ ایک حقیقت ہے تو دوسرا فن، ایک واقعاتی اور واردا تی تو دوسرا فرضی و قیاسی، ایک بالذات دوسرا بالواسطہ لیکن واردات حقیقی ہوں تو غنائی پکار کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔ صرف تاثر اپنا چولا بدل لیتا ہے اور ان صلاحیتوں سے توسیع پیدا کرتا ہے جو غنائیہ شاعری کے محدود میدان میں بروئے کار نہیں آسکتیں۔ اور وضع و ہیئت (گیت، غزلیں، تقریریں، مکالمے) اور تخیلی و ذوقی عناصر (خیالی کردار، مناظر، واقعات، اشارات و کنایات) کے گوناگوں مظاہر ندرت، تنوع اور ترکب پیدا کرتے ہیں جن کا مجموعی اثر نسبتہً کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

"جاوید نامہ" کا شمار موخر قسم میں ہے۔ یہ رویا نہیں تمثیل ہے، مشاہدہ نہیں تخلیق ہے اسلئے اس کا شمار خیالی تخلیقات میں ہے۔ یہاں ہماری توجہ اس نوع کی دیگر مثالوں کی طرف منعطف ہوتی ہے تاکہ ہم جدید فن پارے کو تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں دیکھ سکیں، اور اس کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکیں۔

اقبال اپنی قسم کا تنہا شاہد یا مبصر نہیں جیسا کہ سابقہ حوالوں کے بغیر بادی النظر میں خیال گذرتا ہے ۔ اس کا سلسلہ ماضی میں بہت دُور جاتا ہے ۔ کیونکہ اس قسم کے متعدد نقوش قبل ازیں بھی پیش کئے گئے ہیں ۔ درحقیقت اقبال کا وجدان تمام افضائے عالم کا سنگم ہے ۔ جس میں ہر جانب سے فکری و معنوی دھارے آ آ کر مجتمع ہوتے ہیں ، صرف روایت معراج ہی کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ مذہبی ، ثقافتی ، روحانی جملہ اعتبار سے نوع انسانی کا ماضی اس کا ماضی اور اس کا ورثہ اس کا ورثہ ہے ۔ یہ ایک عظیم ورثہ ہے اور وہ اس کا جامع وہ نقطۂ جاذب جس میں شعاعیں جمع ہو ہو کر پھر افضائے عالم اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مستقبل کی طرف پھیلتی اور عنان تاز ہوتی ہیں ۔ بعض نے ذات باری کو دُجہان کہا ہے کیونکہ اس کے دو رخ ہیں ایک دنیائے مشہود کی طرف اور دوسرا غیر مشہود کی طرف ۔ یعنی اس کے دو عرض ہیں ایک ماضی اور دوسرا مستقبل ۔ یہاں بھی کچھ یہی کیفیت ہے ، کیونکہ اقبال ماضی سے سرمایہ اندوز ہو کر حال کو سیراب کرتے ہوئے مستقبل کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔ اس طرح ان کی تین جہتیں قرار پاتی ہیں ۔ ماضی ، حال اور مستقبل لہٰذا ہم ان کے یہاں تمام نوع انسان کے مقدر کی جھلک پاتے ہیں ۔ ان کی فکری جولان گاہوں پر جتنی بھی نظر ڈالی جائے ، ایک جہان معنی پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے ، تو بہ تو اور تہہ بہ تہہ ۔ بادی النظر میں اسکی جدید وضع افکار اور شخصیت کی پردہ پوش معلوم ہوتی ہے ۔ چونکہ ان کا تعلق زمانۂ جدید سے ہے اسلئے ہم ان کو تمام تر جدید خیال کرتے ہیں ۔ ان کی شخصیت ، ان کی وضع اور فکر و فن جدید لگتے ہیں ، لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان پر ماضی کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے ، اسقدر کہ ہم انہیں

روحانی حیثیت سے ماضی کا مکین اور نقیب سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں: "غیر قرآں در کلام من مجو"۔ ان کی آواز قدیم عرفاء و حکماء کی آواز ہے جس میں ابن عربی، رومی، غزالی، شاہ ولی اللہ وغیرہ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق تاریخ کیا ہے؟ ایک گراموفون جس میں ماضی کی تمام آوازیں بند ہیں۔ اور خود ان کی شخصیت اور کلام بھی ایسا ہی صدا بند ہیں۔ ایک وسیع گنبد جس میں تمام آوازوں کی گونج رہ رہ کر سنائی دیتی ہو۔ ان کی حیثیت ایک مخزن یا قاموس کی ہے۔ اگر ہم فلسفۂ عرفانیات اور دینیات کا عمیق مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اقبال کی جڑیں اسلامیات میں کسقدر گہری پیوست ہیں، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے باریک مسئلوں کے تار و پود اور اصطلاحیں بھی ان میں رلیشہ دواں ہیں، اسلئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ تمام منبع جس سے اقبال کی شخصیت اور افکار ابھرے ہیں، قرآنی و اسلامی ہے۔ ہمیں اس کے ہر نقش کی سند اور اصل اسلامیات سے ملتی ہے۔ خواہ اس پر جدید ذوق اور تخیلات کی کتنی ہی جلاکیوں نہ محسوس ہو۔ اقبال پر برگساں، نطشہ، فشطے وغیرہ کی حکمتِ مغرب کا اثر مسلّم جیسا کہ خلیفہ عبدالحکیم اور دوسرے محققین نے واضح کیا ہے، لیکن جب پوری طرح چھان بین کی جائے تو ہمیں لوزانی سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ وہ قرآن اور اسلام کی حقیقی روح کے ترجمان ہیں۔

اسلام سے قطع نظر قدیم تواریخ اور فکریات کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے، خواہ ان کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے ان کی روحیں بھی قریب و دور سے زندہ رود میں آملتی ہیں اور پھر آگے بڑھتی ہیں۔ "جاوید نامہ" وہ محیط اعظم ہے جس میں یہ اجتماع پوری شدت سے نمایاں ہے۔ وشوامتر اور

بھر تری ہری ہوں یا نطشہ اور طالستائی یا رومی، حلاج، قرۃ العین طاہرہ، غالب اور سعید حلیم پاشا سب ایک ہی مجلس۔ مجلس اقبال میں مجتمع نظر آتے ہیں۔ اور یک دو ساغر کش کی دعوت قبول کرتے ہیں۔ یہ اختلاط تخلیقی سطح پہ ماضی و حال کا اختلاط ہے۔ اس طرح وہ جاودانی عناصر جو ان دونوں میں مضمر ہیں اقبال کی بدولت موجودہ عالم انسانی میں زندہ موثرات کے طور پہ بروئے عمل آتے ہیں۔ اور جب امروز، فردا کا پیش خیمہ ہے تو قدرتی طور پہ فکرِ اقبال کا اثر و نفوذ نوع انسان کے مستقبل پہ بھی حاوی ہوگا۔ اسکی حیثیت کلیدی ہے، اسکی نوا زندگی اور کائنات کے سینے سے ابھری ہے۔ اسلئے یہ لازماً آئندہ نسلوں کے ذہن پہ اثر انداز ہو کر ان کے ذہن کی تشکیل کرے گی۔ اس سے قطع نظر ممکن نہیں، اور اگر اس سے پہلو تہی کی جائے گی، تو خواہ مشرق ہو یا مغرب اس کے لئے انحطاط کا باعث ہو گی، اسے اپنی کوتاہی کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔

یہ ہے فکر اقبال اور جاوید نامہ میں ایک جاودانی جہت کا اضافہ جو دونوں کو جاوید سے جاوید تر بنا دیتی ہے۔ نتیجۃً "جاوید نامہ" کا مقصد و منشاء یہ بر آمد ہوتا ہے کہ ایک عالمگیر پیغام کے ذریعہ حیات کو صحیح نہج پہ لایا جائے اور اس کے قویٰ کو اس طرح مہمیز کیا جائے کہ وہ ارتقائے دائمی سے ہمکنار ہو، یعنی اسے وہ مکارم حاصل ہو جائیں جو منشائے فطرت بھی ہیں اور منشائے الٰہی بھی تاکہ انسان کی نیابت الٰہی کے تحت کائنات مشیت ایزدی کی تکوینی غایت کو پورا کرے۔ اسلامی تصوف میں انسانِ کامل، قطب، مدار اور قیوم کو جو منصب حاصل ہے اسی کا شاہد ہے۔ معراج کا تصور اپنے انتہائی مدارج میں اسی غرض و غایت کی نشان دہی کرتا ہے۔

"جاوید نامہ" کے متعلق بیک وقت دو بظاہر متضاد باتیں کہی جا سکتی ہیں: یہ ایک جدید تصنیف ہے، یہ ایک قدیم تصنیف ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ جو شخص اس نوع کی تصنیف کے پس منظر سے بے خبر ہو اس کے لئے یہ کتاب نفسِ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کلیتہً جدید ہے لیکن جب اس وضع کے تمام ادب کو جو اس موضوع سے متعلق ہے، پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ ایک طویل سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ثابت ہو گی، اوّل تو اس کا موضوع اکثر مذاہب کا مشترکہ موضوع ہے جیسا کہ پیچھے واضح کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ایک سویڈی فاضل جی ولڈن کرین نے "صعود اور صحائف آسمانی" کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء کو اپنی بعثت کے آخر میں کوئی نہ کوئی ربانی کتاب، کوئی نسخۂ شفا یا لوحِ عطا ہوئی جیسا کہ حضرت موسیٰ کے سلسلہ میں ہوا، لیکن پیغمبرِ اسلام کی معراج کو جو مقام اور شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اور کسی کو نصیب نہیں۔ جیسے قبل ازیں کوئی واقعہ مطلقاً ظہور پذیر ہی نہیں ہوا۔ اور آج تک اس کو منفرد حیثیت حاصل ہے۔ یہ روحانی صعود کی اعلیٰ ترین اور معروف ترین مثال بن گیا ہے۔ جس نے پیروانِ اسلام ہی نہیں دیگر مذاہب کے پیروؤں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، اور کشفیات، تخیلات اور تخلیقات کے ایک وسیع سلسلہ کو جنم دیا ہے۔ اس کی حیثیت آفاقی ہے۔ معراج نبوی نے ایک مثالی مشعل روشن کر دی ہے جس سے تمام فضائے عالم جگمگا اٹھی۔ عروجِ روحانی کو پیش کرنے کا یہ پیرایہ سب سے منفرد اور دلفریب ہے۔ کیونکہ اس میں کشادِ روحانی، کشادِ ذوق، کشادِ تخیل، سب کا سامان موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اہلِ شوق کو ایسی تحریک دلائی ہے کہ تب سے اب تک ہر فرد مجاہدہ و ریاضت سے ولایت اور رویتِ حق کے لئے کوشاں رہتا ہے، چنانچہ صوفیا کے تذکرے، کشف و کرامات کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کہا

جا سکتا ہے کہ یہ درحقیقت مادی ذرائع کے مقابلے میں روحانی ذرائع سے بدرجہا زیادہ قدرت اور توانائی پیدا کرنے کی کوشش تھی اہل تصوف اپنے طریق سے دنیا و مافیہا پر وہ استیلا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو آج کے سائنسدان اپنے طور پر حاصل کر رہے ہیں۔ عبدہٗ اور قیوم کائنات پر قدرت کاملہ رکھتے ہوئے اس پر حکمران ہی نہیں بلکہ صفاتِ الٰہیہ میں شریک ہو کر نظامِ تکوینی میں بھی دخیل ہیں۔ مگر با ایزد انباز است آدم۔ اسی لئے اولیاء اور روحانیین حاضر کے بجائے غائب اور ناسوت کے بجائے عالم ملکوت و لاہوت کے زیادہ دلدادہ رہے ہیں، ان کی اقدار روحانی اقدار ہیں یہاں تک کہ مادی اقدار پر بھی روحانی اقدار ہی کا غلبہ تھا۔ یقیناً تخیلی اعتبار سے اس نوع کی زندگی خاصی دلچسپ ہے۔ یہاں تک کہ آج کا مادیت پرست انسان بھی امور غیب اور خارق عادت میں کشش محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس سے قطع نظر معراج یا روحانی عروج کا تصور ایسا دلکشا ہے کہ خواہ اس کے زیر اثر انسان کوئی رویا دیکھے یا نہ دیکھے، عالم اسرار کی سیر کرے یا نہ کرے، اس کا وجدان ایک روحانی لگن سے معمور ہو جاتا ہے اور مراقبہ و استغراق پر منتج ہوتا ہے۔ جو بمنزلہ معراج ہے۔ یہ محض ایک وجدانی کیفیت ہے۔ ہاں جب صاحب واردات اسکو ضبطِ تحریر میں لے آتا ہے یا اسکو مشاہدات کی شکل دے دیتا ہے تو اس کا تجربہ معراج ہی کے مشابہ بن جاتا ہے۔ باطنیت کا فروغ دورِ سلف کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس میں ہر فرد الٰہیت کے نشے میں اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے کا نوا سنج تھا۔ روحانیت کے نسخۂ کیمیا کی تلاش خود بخود تکمیل انسانیت کے تصور کی طرف لے جاتی ہے جس کی مثال معراج نبوی تھا، اور اس کے مشابہ درجہ تک رسائی کا سزاوار انسانِ کامل۔ معراج

اور انسان کامل کا تصور لازم و ملزوم ہیں۔ انسانِ کامل کے درجہ پر فائز ہونے کے لئے عرفانِ نفس اور عرفان حق شرط ہیں۔ اسکے ساتھ ہی عرفانِ کائنات بھی لازم ہے۔ کیونکہ عالمِ صفات جلوۂ ذات کا مظہر ہے۔ "المجاز قنطرۃ الحقیقت"۔ لہذا توحید الٰہی کے مرکزی تصور کے تحت لائحۂ عمل یہ قرار پاتا ہے کہ انسان کائنات کے مافی الضمیر میں سرایت کرے، اس کی ماہیت کا ادراک کرے اور سمجھ لے کہ یہ شئی فی الخارج نہیں۔ عارف کو رفتہ رفتہ تمام کثرت عالم مثال میں متحد دکھائی دیتی ہے۔ انسان، ممکنات اور ذات بالآخر وحدت کا ادراک پیدا کرتے ہیں۔ جو سالک یا عارف کا انتہائی درجۂ عرفان ہے۔ اس طرح اسکی ذات خود آئینہ بن جاتی ہے۔ جس میں حق اور اس کے کائناتی مظہر منعکس ہوتے ہیں۔ یہی روح کا لمحۂ روشن یا اشراق ہے۔ یہیں سے دل کو جلا دینے کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ جس کا سلوک و عرفان کی دنیا میں اسقدر چرچا رہا ہے۔ اس میں اشراقی تصور کے مظاہر بوعلی سینا کی تین روحانی دستاویزیں ہیں۔ "الصلاۃ"، "حی بن یقظان" اور "اشارات"۔ ان سب کو ایک مرکزی احساس کے تحت لکھا گیا ہے، اسلئے ان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں کوئی پیرایہ خارجاً عاید یا مرتب نہیں کیا گیا، بلکہ توحید و عرفان کے جامع مرکزی تصور سے ابھرتا ہے۔ جب ہم "اشارات" پر نظر ڈالتے ہیں تو ذہن فوراً جاوید نامہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں اس کا نقشِ اولیٰ ہاتھ آجاتا ہے۔ پیشکش کائنات کے نمونے پر کثرت میں وحدت کی برجستہ مثال ہے۔ اور مناظر و مرایا کے ساتھ تمثیلات گوناگوں مناسبتوں سے جداری نقاشی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ تا حد نظر علامات اور مظاہر کا وسیع توشہ خانہ ہے۔ اپنی ان تصنیفات میں بوعلی اندر غبارہ ناقہ گم نہیں۔ بلکہ

عین دست بر پردۂ محمل نظر آتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ وہ درونِ محمل ہے۔ اس کے یہاں حقیقی درونیت ہے۔ چونکہ وہ بھی رہ نوردِ شوق ہوتے ہوئے رہ نوردِ کائنات بھی ہے، اسلئے اس کے یہاں زہرہ و ماہ و مشتری سیاحت علوی کا لازمی جز ہیں اور ان کے بارے میں بوقلموں محیر العقول مشاہدات بھی ہیں۔ یہ مشاہدات بے حد دلچسپ ہیں۔ تمثیلات کے زنجیرے بھی خوب مربوط ہیں۔ اگرچہ ان کی دلالتیں صریح طور پر تعبیری ہیں۔

ایک اور کتاب "الطیر" کا عنوان صریحاً غماز ہے کیونکہ اس میں پرواز کا وہ عالمگیر استعارہ ہے جس نے بعد میں "منطق الطیر" کی تمثیل پیدا کی۔ یہ ایک اور شاہکار ہے جس نے آگے چلکر جاوید نامہ کو وضع خاص عطا کی۔

ابن سینا ہی کے نمونے پر ابن طفیل نے "حی بن یقظان" تحریر کی جس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں عقل و نقل اور مشاہدۂ حق کو شیر و شکر کیا گیا ہے، اس کے علم و دانش کی بنیاد حسی مشاہدہ اور عقل و فہم پر استوار ہے۔ سالک درون خود کھو جانے کے بجائے بیرونِ خود نظر ڈالتا ہے جس سے اس کا شعور بتدریج ترقی کر کے انتہائی بصیرت پیدا کرتا ہے:۔

دخترکے بر ہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بہ خویشتن نگر

اس بنیادی فرق کے باوجود اس تصنیف کی وضع بھی تمثیلی ہے۔ مصنف نے عقل و فہم اور تجربہ اندوز کو حی بن یقضان کا نام دیا ہے۔ مستشرقین نے اس تمثیلی کہانی کا ماخذ ایک اسپینی لوک کہانی "کرتی کون"

بتایا ہے۔ خبر نہیں یہ ابن سینا کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے یا کسی اور کا نتیجۂ فکر۔ مگر اس کی زندہ رود سے معنوی مشابہت دلچسپی سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں بیداروں کا زندہ سورج۔ نسبت دور ہی کی سہی لیکن کچھ عجب نہیں یہ خفیف سی نسبت بھی فکری ہم آہنگی کا کرشمہ ہو۔ یہ علامت کی بہت عمدہ مثال ہے۔

اس صنف میں ایسی ہی تمثیلی کوششوں کا ذوق و شوق ابن ماجہ کی ایک تصنیف "تدبر المتوحد" سے ظاہر ہے جو اب نایاب ہے۔ اس سلسلہ میں ابن عربی کی "فتوحاتِ مکیہ" سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی عظیم شخصیت اور افکار کی گہرائی نے مشرق و مغرب کو اس شدت سے متاثر کیا کہ اس کے اثرات ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ یہ فلسفۂ عشق کی عربی روایت ہی تھی جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے ابن العربی اور اس کے پیشروؤں تک جا پہنچی۔ عرب شعراء ابتدا ہی سے کسی لیلیٰ، کسی عذرا، کسی نائلہ یا لبنیٰ کو عشق کا محور بنانے کے خوگر تھے۔ یہ انسانی رشتہ قدرتی طور پر کائنات کے ساتھ بھی رشتہ استوار کر دیتا ہے جس سے اس کی شناسائی میں مدد ملتی ہے۔ یہی صورت حال مرشد کی بدولت بھی پیدا ہوتی ہے جس کی حیثیت بمنزلۂ محبوب ہے۔ ابن عربی کا مرجع شوق ایک لڑکی نظام تھی۔ حسین و جمیل، خوش گفتار، پاکیزہ نہاد جس کے پسندیدہ اوصاف نے اسے شاعر کی نظر میں ایک ایسا پیکرِ نور بنا دیا جو عین الشمس والبہا کہلانے کا مستحق ہو۔ یعنی خورشید جہاں تاب اور اسکی تابانی کا سرچشمہ جو عظمت، جلال اور تجلیات کا مظہر ہے۔ "ترجمان الاشواق" کی دوشیزہ، آفتاب اور نور کا سرچشمہ! ایک حقیقی مگر مثالی ہستی۔ اس سے بہتر القاب ممکن نہیں۔ حسن کا حسن اور علامت کی علامت۔ اس سے کائنات کی زیبائی اور

تابانی ایک براق پیکر میں سمٹ آئی ہے، اور تمثیل کا حق ادا کرتی ہے۔ اس سے بیاطرس تک جو اس کا الوہی روپ ہے، کتنا فرق ہے! کیونکہ دانتے نے ایسے ہمہ شوق کا تصور ابن عربی سے حاصل کیا تھا، اور اس کا پیش رو پٹرارک بھی لارا کو اپنی محبوبہ ٹھہرا کر یہی نغمۂ شوق سنا چکا تھا۔ یہ روایت یہیں نہیں رک گئی بلکہ فلسفۂ عشق اور اشراق کے ساتھ ساتھ اول ہسپانیہ سے اطالیہ تک پھیل گئی اور پھر نامعلوم راہوں سے دیگر مغربی ممالک تک پہنچی، چنانچہ ڈی لارس کی "رومانس آف دی روز" اس کی شاہد ہے۔

اس سلسلہ میں عشق، خصوصاً فلسفۂ عشق کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ یہ بات اچنبھے سے خالی نہیں کہ گو لفظ "عشق" عربی ہے اور امیرِ عشق، قیس عامری عرب تھا، لیکن عشق قرآن و حدیث تو کیا جاہلی شعراء کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ بعد میں بھی اس کا ذکر شاذ ہے، نیز عشقیہ کیفیات کا بھی وہ زور و شور نہیں جو فارسی شاعری میں ہے۔ یہ عشقِ الٰہی میں غرق اہل حال صوفیا ہی تھے جنہوں نے عشق کو حقیقی معنوں میں عشق بنایا اور اس کا سلسلہ خود ذاتِ الٰہی سے جا ملایا جو بیک وقت حسن بھی ہے اور عشق بھی۔ اُخوان الصفا کے رسائل اس کے نظریات کا بھرپور مخزن ہیں۔ اگر عشق ہی کائنات کی روحِ رواں اور سویدائے حیات ہے، تو بیشک سنائی کے الفاظ میں سب کچھ عشق ہی عشق ہے اور اس کی حریف عقل ہیچ۔ تب سے دونوں میں ہنگامۂ کارزار گرم ہے۔ مشرقی اور مغربی سریان پر بحث کرتے ہوئے برنڈ مینؤل ویشر نے معلم اول اور اس کے پیروؤں کے عقلی تصور عشق کا موازنہ رومی اور دیگر صوفیا کے خالص عشقیہ تصور سے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گمبھیر تصور اسلامی سریان ہی کی راہ سے مغرب پہنچا

ورنہ عشق کا یہ شور و مستی اور جذبۂ خالص اس سرزمین میں ناپید تھا۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ قدیم انسان محبت کے جذبۂ شریف سے ناآشنا تھے۔ اس نے نطشہ کی زبانی بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ "رومانوی محبت" مغربی یورپ کے گشتی موسیقاروں کی ایجاد تھی جو گلی گلی کوچہ کوچہ پھر پھر کر عشق و محبت کے گیت گاتے تھے۔ اور یہ عین وہ علاقہ ہے جہاں عرب مغنیوں نے محبت کے سلگتے ہوئے گیت فضاؤں میں لبسائے تھے۔ غرض محبت کا رسیلا پھل بھی یہاں انہیں ہاتھوں نے دیا جنہوں نے کھجور کا میٹھا پھل دیا تھا، اور رفتہ رفتہ یہ مٹھاس ساری فضا میں رس بس گئی۔

عربی روایت اور معراج نبوی کا اثر سالہا سال کے اس وسیع اثر ہی کا حصہ ہے جو اسلامی دور میں مغربی یورپ پر مترتب ہوا۔ اور یہ کسی خاص طبقے یا چند افراد تک ہی محدود نہیں بلکہ عام تھا۔ اس میں دانتے یا کسی اور کی کوئی تخصیص نہیں، اس خطے کے تمام لوگ اسلامی تہذیب سے قبول اثر میں شریک تھے۔ بالفرض اگر دانتے اس خصوص میں تنہا تھا تو بھی یہ تہذیبی اثر کی بین علامت ہے جسکی اہمیت ظاہر ہے، لیکن اسلام کا دیرپا اور دور رس اثر ایک وسیع عرصے پر پھیلا ہوا ہے؛ جس کا سلسلہ خاصا دراز ہے، اور اس میں کتنی ہی نسلیں حصہ لیتی رہیں۔ دانتے سے پہلے یہ اثر بھرپور رجاؤ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ خواہ اس حقیقت سے کتنی ہی پہلوتہی کی جائے، اب یہ پوری طرح ثابت ہو چکا ہے کہ اسلامی اثر مغربی نشاۃ الثانیہ کا محرک اولی تھا۔ یہ محرک نہایت قوی اور موثر تھا جو مغرب کے رگ رگ اور ریشے ریشے میں سرایت کر گیا۔ اسپینی محقق پروفیسر آسن نے سب سے پہلے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا، اور وہ بھی خود دانتے ہی پر اسلامی اثرات کی نشان دہی کر کے حالانکہ دانتے نصرانیت کا مبلغ اعظم تھا اور اسلامیات

کے ساتھ اسے دور کی مناسبت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو بے نقاب کرنے پر مغرب کی دنیا میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن تحقیق کا سلسلہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو رکتا نہیں۔ بعد میں اور بھی انکشاف ہوئے، اور اب دانتے کی خرمنِ اسلام سے خوشہ چینی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے جو اس کے گرد و پیش کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

جس روایت سے دانتے نے استفادہ کیا وہ کم از کم چھ سو سال پہلے مرتب ہو چکی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر تیرھویں صدی تک محدثین، مفسرین، علماء فضلاء، اور صوفیا اور حکماء و شعراء اس کی تشکیل میں منہمک رہے۔ اور اسکو وضع و شکل اور کیف و رنگ عطا کرتے رہے۔ اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ مذہبی قصص و حکایات، تاریخ و سیر، آثار و اخبار اور تحقیقات و روایات کا ایک بے اندازہ طومار تھا جس پر افسانہ طرازی کی حاشیہ آرائی مستزاد تھی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سالہا سال کی سعی و کاوش سے بہشت کی کیفیت، اس کے مدارج، دوزخ کے احوال اور طبقات، آئینِ مکافات بہ شکل مجازات حکمت و دانش، مسائل و معارف، مشاہدات و مناظرِ فطرت، سکون و سیر، افراد و رجال، واردات و وجدانیات، حوادث و واقعات، رموز و کنایات، وظائف دلیلِ راہ اور ادب و فن کے اوصاف عالیہ سب کے سب ترتیب و تدوین اور تہذیب کے مرحلے سے گذر کر اعلیٰ تراش خراش پیدا کر چکے تھے۔ اسن نے اس تمام مواد کو تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ بلاشبہ اس روایت کے مقابلے میں عالم بالا سے متعلق کوئی ایسی مقدس تہذیبی روایت نہ تھی جو اس قدر سیر حاصل، پختہ و بالیدہ، تربیت یافتہ اور آراستہ و پیراستہ ہو۔ کیونکہ یہ وہ روایت تھی جو ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں تھی اور برس ہا برس ہر لمحہ

اس کے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نشو و نما پاتی رہی۔ جہاں کہیں بھی مسلمان تھے ایسی روایات خود بخود ابھر ابھر کر نشو و نما پاتی تھیں۔ کل مواد تین قسم کی روایات پر مشتمل تھا :

۱ - دینی و عرفانی - جن میں مشاہدۂ تجلیٔ ذات کا بیان تھا -

۲ - صوفیائے کرام کے وقایع معراج -

۳ - خالص ادبی و فنی جن میں یہ لازم نہیں کہ وہ محض واقعات معراج پر مشتمل ہوں۔

ان میں دوسری نوع جو علمی بھی ہے اور مذہبی بھی، خاصی وسیع ہے۔ کیونکہ اولیاء، صوفیاء اور عرفاء کی کثیر تعداد نے حسب مراتب گوناگوں مشاہدات کئے ہیں۔ اور ان کو معراج ہی قرار دیا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے "فتوحاتِ مکیہ" اور اپنی دیگر تحریروں میں اپنے مشاہدات قلم بند کئے ہیں۔ اور ذاتی معراج کی کیفیت بیان کی ہے۔ انہوں نے آسمانی سیاحت کے دوران میں دو افراد کو دلیلِ راہ بنایا۔ ان میں سے ایک عالمِ دین تھا اور دوسرا فلسفی۔ چونکہ ان کی دلچسپی مذہبیات سے تھی، اس لئے انہوں نے دینی مسائل پر ہی بحث کی ہے۔ دوسرے اہلِ دل ہونے کے باعث انہوں نے اپنے کشفیات و الہامات ہی کا احوال بیان کیا ہے۔ ان بیانات میں مذہبی و اخلاقی مباحث بدرجہا زیادہ ہیں۔ منازل و مراحل، واقعات و مشاہدات، واردات و کیفیات تمام معراج نبوی ہی کے انداز میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مستِ ذات صوفیا کا سروکار مجرد حقائق اور محض واقعات ہی سے ہو سکتا ہے۔ انہیں ادب و فن یا تمثیل سے چنداں سروکار نہیں۔ چونکہ احادیث میں سات آسمان اور نو سیارے مذکور ہیں، اسلئے ابن عربی نے بھی انہی کا التزام کیا ہے۔ حیات بعد الممات ان کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث تھی۔ ڈیوائن

کومیڈی سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکی بنیاد بھی ایسے ہی مباحث پر استوار ہے۔ عارفانہ اور فنی حیثیت سے کومیڈی اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ البتہ اس کا فنی پہلو زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ اسکی حیثیت ادبی ہے۔ اکثر امور مثلاً طبقات، منازل، دوزخ اور متداول علوم میں دانتے ابن عربی ہی کے نقشِ قدم پر چلا ہے۔ جلاوطنی کے سبب اسے قدرتی طور پہ اپنے عہد کے سیاسی و تاریخی حالات و واقعات سے گہری دلچسپی تھی۔ اور یہی کومیڈی کی تصنیف کا باعث ہوئے جس میں ان پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ دانتے نے اپنی تصنیف پیش کر دینے ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اور مآخذ کی نشان دہی نہیں کی۔ لیکن اب تحقیق سے وہ گمشدہ کڑیاں بھی سامنے آگئی ہیں جن کے بغیر اخذ و استفادہ کی کیفیت نا تمام رہ گئی تھی۔ معراج نبوی کے اسپینی، لاطینی اور فرانسیسی نسخوں کی موجودگی نے آسن کو بے حد تقویت پہنچائی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دانتے کو کسی نہ کسی شکل میں معراج سے متعلق اسلامی روایات کا کی حقہ، علم تھا۔ اور اس نے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ بعض تفصیلات کا سلسلہ ایسی چھوٹی چھوٹی جزئیات تک جاتا ہے کہ عوام تو کیا خواص کو بھی ان کا چنداں علم نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ حضرت علی کا چہرۂ مبارک تلوار سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا جو بقول دانتے فرقہ پرستوں کی سزا ہے یا یہ کہ آنحضرت یروشلم سے زینہ پہ چڑھ کر پہلے آسمان پہ تشریف لے گئے تھے دانتے کے ماخذوں میں بھی زینہ کا ذکر ہے۔ حالانکہ نصرانی روایات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

ان امور سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ دانتے کو اسلامیات سے غیر معمولی واقفیت تھی اور اس نے اس ماخذ سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ اصل سوال عالمی تاریخ کی طرف صحیح اعتنا کا ہے قرونِ وسطیٰ کا مطالعہ کرنے والے مغربی فضلا کا رویہ اسلام اور اس کے پیروؤں کے بارے میں منفی رہا ہے۔ اسکی بنیاد

مغربی پاسداری اور حقائق کی پردہ پوشی کے غلط رویّے پر تھی جس نے عالمی تاریخ کو یونانِ قدیم اور جدید یورپ ہی کی تاریخ بنا کر رکھ دیا۔ اور اسلام کی نہایت اہم کڑی حذف کر دی جو اس ضمن میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ فضلائے مغرب یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ دانتے کا مغربی حلقے سے باہر بھی کسی ماخذ سے سروکار تھا۔ حالانکہ قرونِ وسطیٰ میں اہل یورپ کو اسلامیات کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ سروکار تھا جتنا کہ بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے۔ یہ بعینہٖ ویسا ہی تعلق تھا جیسا کہ آج مشرق کو مغرب سے ہے۔ ان دنوں تہذیب بڑی حد تک اسلامی تہذیب ہی سے عبارت تھی۔

دانتے نے مذکورہ بالا اجزا کو آپس میں جوڑ کر قرونِ وسطیٰ کے افکار کا ایک شاندار نگار خانہ ترتیب دیا۔ یہ نصرانی، کلاسیکی اور اسلامی عناصر کا متوازن امتزاج تھا۔ لہٰذا اس کے یہاں اسلامی ماخذ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔

"فتوحاتِ مکیہ" کی طرح بایزید بسطامی کی معراج روحانی نے کوئی مرتب شکل اختیار نہیں کی۔ لہٰذا ان کے مشاہدات تصوف کی کتابوں میں متفرق نقوش ہی کے طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔

ابن عربی کی طرح عبدالکریم الجیلی کا شمار بھی اہلِ حال ہی میں ہے۔ اس نے انسان کامل پر ایک رسالہ تحریر کیا اور اپنے مشاہدات اور واردات قلمبند کئے ہیں۔ منجملہ دیگر امور کے اس کے یہاں عبدہٗ کا تصور جسے شاہ ولی اللہ کے "قیوم" کے ساتھ بدیہی مناسبت ہے، بہت نمایاں ہے۔ اور "جاوید نامہ" کے اوراق اس کے عمیق اثر کے شاہد ہیں، ابنِ سینا کی طرح الجیلی نے بھی مختلف افلاک کی فضائی کیفیتیں متعین کی ہیں۔ یہ وہ خلائی سماں تھا جس میں اقبال نے اپنے مقاصد کے پیش نظر ردوبدل کیا ہے۔

اسلامی دنیا میں انسان کا تصور جس حد تک جزوِ حیات رہا ہے، اس کا قدرتی تقاضا یہ تھا کہ ہر فرد خود کو کمالِ روحانی کے انتہائی درجے تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور سیرِ آسمانی کو ذاتی معراج کی شکل میں پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر اسلامی زبان میں معراج سے متعلق حکایات و بیانات موجود ہیں۔ جن میں سے بعض طویل اور بعض مختصر پیمانے پر ہیں۔ ازاں جملہ بعض تبرکاً وتیمناً لکھے گئے ہیں اور بعض فن میں کشادگی پیدا کرنے کے لیے۔ برصغیر پاک و ہند کے معروف اہلِ باطن میں شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جس نے معراج پر ایک مستقل رسالہ موسوم بہ "رسالہ معراجیہ" لکھا اور اس میں ذاتی معراج کا دعویٰ کیا۔ غالب کی مثنوی "ابرِ گہربار" میں "بیانِ معراج" معراجِ نبوی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ فارسی وار دو سے قطع نظر پنجابی میں بھی متفرق معراج ناموں کے علاوہ جو شعری تصنیفات [illegible] شامل کئے گئے ہیں، ایک مستقل معراج نامہ منظوم ہے جو زبان و مطالب دونوں کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔

معراج کے تصور میں جو قدرتی دلکشی ہے وہ اہلِ حال ہی نہیں بلکہ سب کے لئے طبع آزمائی کی مستقل دعوت ہے۔ چنانچہ اہلِ قال یعنی شعراء نے بھی اسکو بصد شوق لبیک کہا ہے۔ اور اس پر اپنے اپنے انداز میں سخن آرائی کی ہے۔ یہ حقیقتاً "سخن آرائی" ہے، کیونکہ اس میں فن اور شوخیٔ اندیشہ کو زیادہ دخل ہے۔ اس روش کی طرح نابینا شاعر ابوالعلیٰ معری نے ڈالی۔ اس دلچسپ جرأتِ رندانہ کی تحریک ابوالقارح حلبی کے اس طنزیہ سے ہوئی جس میں رند مشرب فاسق و فاجر شعراء و ادباء کو ذاتِ باری کا موردِ عتاب دکھایا گیا تھا۔ اور ان سب کے منجملہ معریؔ بھی عتابِ الٰہی کا ہدف تھا۔ معری کی شوخیٔ فکر نے اس کا برجستہ جواب دیا، یعنی بہشت و دوزخ کا ایک فرضی سفر نامہ ترتیب دیا جو "رسالۃ الغفران" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں

باری تعالیٰ کی شانِ کریمی دکھائی گئی ہے جو اہلِ عصیاں کے عرقِ انفعال کو موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔ لہٰذا لاابالی شعراء کو جنہوں نے موت سے پہلے توبہ کر لی تھی قابلِ مغفرت قرار دیا ہے۔ اور انہیں جنت میں قیام پذیر دکھایا ہے۔ آسن کی رائے میں دانتے کی نظم کے بعض اوصاف خصوصیت کے ساتھ "رسالہ غفران" سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ اس نے قدیم و معاصر شعراء کے کلام کے علاوہ دوران ملاقات لسانی بحثیں بھی کی ہیں جن سے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ محدود نہیں رہتا۔ اقبال کی دلچسپی نظریاتی ہے۔ اس لئے وہ صرف ایسے افراد یا حالات کو پیش کرتے ہیں جو ان کے بنیادی مقاصد کے لئے مفید ثابت ہوں۔

معرّی کے بعد دوسرا نقش شہرزوری کا "قصیدۂ مسافرت روحانی" ہے جسے ابوالعباس احمد بن خلکان نے نقل کیا ہے اور جو ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

غرض یہ تھا وہ کل سرمایہ جو دانتے کو اسلامی ذرائع سے ہاتھ آیا اور جس کو اس نے اپنی خداداد صلاحیت سے ایک لازوال مرقعِ فن کی حیثیت عطا کی۔ ایک نامور مستشرق نے سرزمین یونان سے ذہنی و فکری سلسلوں کا سراغ لگاتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کس طرح وہ خام مواد جو صاحبِ فن کو ہاتھ آتا ہے وہ اس کے کرشمۂ تخلیق کی بدولت ذاتی مشاہدات کی رنگ آمیزی کے ساتھ نئے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ وہ مہم ہے جس کی کامیابی تمام تر اس کی قدرتِ جمع پر موقوف ہے۔

دانتے کی کامیابی مہم آوری کے علاوہ اس کی غیر معمولی تعمیری و تخلیقی قوت کی بھی رہینِ منت ہے۔ وہ فطرتاً شاعر ہے جس کو حقیقت کی بہ نسبت جمال زیادہ عزیز ہے۔ اسی لئے اس کی نظم ایک ایسی تمثیل ہے جس میں ذوق و فن مشاہدات پر غالب ہیں۔ اور اسے مخصوص ادبی وضع عطا

کرتے ہیں ۔ اس نے اپنی اختراع فائقہ میں ہنر و فن کے وہ تمام گُر برتے ہیں جو اسے سالہا سال کی پرورشِ فن سے ہاتھ آئے تھے ۔ اور طباعی کے وہ خداداد جوہر بھی جو مبدءِ فیاض کا عطیہ خاص ہوتے ہیں ۔

مشاہدات بھی اہلِ باطن کے مشاہدات نہیں بلکہ زیادہ تر حالات و واقعات ہیں ۔ اسی طرح وہ اہلِ فکر کی طرح فلسفے کی گتھیاں نہیں سلجھاتا اور فن کے جوہر بہر حال غور و فکر پر غالب رہتے ہیں ۔

یہ واضح کرنے کے لئے کہ خیالی سفر پیمائی کی دلچسپی عارضی نہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے ، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مغرب میں طربیۂ خداوندی کے بعد بھی ایسے کتنے ہی تمثیلی نقوش وجود میں آتے رہے جن میں گوئٹے کا "فاؤسٹ" بالخصوص نمایاں ہے ۔ اس نے اقبال کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا ۔ اگرچہ کومیڈی کی طرح یہ سفرنامہ تو نہیں ، لیکن جس طرح "فاؤسٹ" مختلف مرحلوں سے گذرتا ہے اور مے فسٹوفلیس سائے کی طرح ایک منفی رہنما کے طور پر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے ، اسے کافی حد تک ایک روحانی سفر بنا دیتا ہے ۔

شیلے کی "پرومیتھیس اَن باؤنڈ" (PROMETHEUS UNBOUND) اور ہیلاز (HELLAS) تمثیلی حیثیت سے دو اور نظمیں ہیں جن میں جاوید نامہ کی مرکب وضع کی مشابہت ملتی ہے ، دوسری ہم وضع تمثیلی تخلیقات کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے ۔

مشرق میں عراقی شاعر جمیل سیدی الزہاوی کا ایک طنزیہ "جہنم میں بغاوت" نسبتاً حالیہ پیشکش ہے جس کی نوعیت خالص عربی ہے ۔ نیاز فتح پوری کے قلم سے بھی ایسی ہی تصنیف مروی ہے جو شاید

اسی کا عکس یا بدلا ہوا روپ ہو۔ فضل حق کی "زندگی" کا اپنے عہد میں خاص چرچا رہا جسے اردو کی (PILGRIM'S PROGRESS) سمجھنا چاہیئے۔ آغا ضیا مرحوم کی "زندہ رود" (۱۹۵۹ء) جاوید نامہ ہی کے رنگ میں دو مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیش لفظ میں "زندہ رود" کی تشریح کرتے ہوئے اسے "برزخِ خیال کی غیر فانی امرت لہر" قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح شاعر کی جوئے خیال دو مثنویوں کی تمثیلی آبنائے میں موجزن ہے۔

اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کر لی جائے تو ان تمام ادب پاروں میں ایک ہی روح دائر و سائر دکھائی دے گی۔ اگرچہ "جاوید نامہ" یا اس کے مصنف کا تعلق صرف انہی تخلیقات سے ہو سکتا ہے جو اس سے پہلے بروئے کار آئیں۔ بعد کی تصنیفات کا ذکر صرف اسلئے کر دیا گیا ہے کہ اس سلسلہ کی مجموعی کیفیت واضح ہو جائے۔ اور ہم اس کی روشنی میں "جاوید نامہ" کا جائزہ لے سکیں۔

ہر تخلیق کی طرح یہاں بھی پہلا سوال یہ ہے کہ شاعر کے مافی الضمیر میں کیا تھا اور اس نے اس کو کیا پیرایہ عطا کیا۔ اور اسے قوت سے فعل میں لانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیں۔ مافی الضمیر سے مراد وہ تمام سلسلۂ افکار و خیالات نہیں جو مجموعی صورت میں اسکے سامنے آیا۔ بلکہ وہ نفس شے ہے جو اس کے بطون میں بالقوۃ موجود تھا، اور متاثر شعور نے اسے دھندلکے سے باہر لانے کی کوشش کی۔

اقبال کا مسئلہ آنی اور جاودانی کا دیرینہ مسئلہ ہے۔ یعنی انسان ارضی ہونے کے باوجود افلاکی کیسے بن سکتا ہے۔ اور بہترین زندگی بسر کرنے کے لئے بہترین دستور العمل کیا ہے۔ اس کا جواب وہ افکار ہیں جو اقبال نے اپنے فلسفے کی روشنی میں حیات، کائنات اور حق کی تثلیث کے متعلق قائم کئے تھے اور جن

اظہار کا وسیلہ یا بہانہ بنایا ہے۔ قبل ازیں بھی اس نے ایسا ہی پیرایہ اختیار کیا تھا لیکن نہایت محدود پیمانے پر۔ مثلاً جواب شکوہ میں کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی ہیں، غزلیات، تضمینات، گیت اور نظمیں بھی، لیکن "جاوید نامہ" میں موضوع کی وسعت اور متنوع وضع کے پیشِ نظر پہلی بار وسیع پیمانے پر فرضی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، تاکہ ہر قسم کے موضوعات، مسائل، شخصیات، مواضع اور مناظر و مرایا کا احاطہ کیا جاسکے جن کا اس قسم کی طویل بیانیہ ڈرامائی پیشکش میں پیدا ہونا لازم ہے۔ ڈرامائی رد در حقیقت اسکی افسانوی نوعیت کا جزو ہے جس کے لازمی تقاضوں کے تحت شاعر اپنے افکار کا براہِ راست ترجمان نہیں، بلکہ اپنے پیر و مرشد رومی کے حسب ارشاد سرِ دلبراں کو حدیثِ دیگراں کے پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ یہ اچھوتی آڑ ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی تمثیل اعلیٰ نوعیت کی تمثیل ہے، خالص تمثیل سے مختلف جس میں کردار اپنے ہی تشخص میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اور پردہ صریحاً ایک مخصوص دلالت کی بنا پر پردہ برانگن ہوتا ہے۔ جیسے "منطق الطیر" میں۔ اور مشخص اور مشخص بہ میں واضح نسبت یا قرینہ پایا جاتا ہے۔ جیسے اسپنسر کی فیری کوین (FAERIE QUEENE) یا ہمارے یہاں چودھری فضل حق کی تمثیلی تصنیف "زندگی" میں۔ "جاوید نامہ" میں بھی کہیں کہیں ایسے صریح مدلول موجود ہیں لیکن بہت کم اور بقدرِ ضرورت۔ نیز ان کی صراحت ایک شگفتہ اور کثیر المعنیٰ علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ جیسے افرنگیں، زروان اور سروش۔ مطلب یہ کہ جاوید نامہ میں اس قسم کی تمثیلات دلالت سے اس طرح منسلک نہیں کہ وہ اس کے ساتھ چپک کر رہ جائیں۔ جیسے "زندگی" میں عشرت جہاں جس میں کنایہ بڑی حد تک مدلول بالذات ہے، اور اس علامت سے ذہن میں کشادگی کے بجائے

من وعن واقعیت کا احساس غالب رہتا ہے۔

جاوید نامہ بنیادی طور پر غنائیہ ہوتے ہوئے مغنی نامہ بھی ہے۔ اور اول تا آخر مجموعۂ اغانی معلوم ہوتا ہے۔ ابتداءً یک نوا ہوتے ہوئے یہ آہستہ آہستہ دُو نوا ہوتا جاتا ہے۔ جب زندہ رود اور رومی یکجا اور ہمنوا ہوتے ہیں پھر آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے دوسری نوائیں بھی پیدا ہوتی جاتی ہیں اور دو نوائی کثیر نوائی میں مبدل ہو جاتی ہے۔ جیسے گایکی کا آغاز تو الاپ سے ہو اور وہ بڑھتے بڑھتے سنگت بن جائے۔ کومل تیور سُر مل کر سمپورن راگ بن جائیں جن کی نو استاروں کو بھی ہم صفیر بنالے اور رفتہ رفتہ کائناتی لے کا روپ دھارن کرے۔ یہ گایکی اکہری یا الیکانکی نہیں، دوہری، تہری، تہہ در تہہ ہے۔ پردۂ سیمیں پہ روشنی اور آواز کی لہریں ابھرتی، امنڈتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ تا آنکہ جس طرح ابتدا ایک آواز سے ہوئی تھی، اسی طرح ایک ہی آواز۔ صدائے دردناک پہ ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ارغنوں کے تمام سُر سُر تیاں مل جل کر راگ سبھا بن جائیں اور گمبھیر تال میل سے جمگھٹ پیدا کرنے کے بعد افتتاحی دھن کے ساتھ فضا میں کھو جائیں۔ اس طرح مجموعی کیفیت ایک بحرِ بیکراں کی ہے جس کی افتاں و خیزاں موجیں اور لہریں تختہ بہ تختہ امنڈتی اور لہراتی ہوئی ایک دوسرے سے ہمکنار ہوں۔ اور آخری مسحور کن ابھار کے ساتھ سمندر کی پہنائیوں میں گم ہو جائیں۔ اپنی آخری صورت میں ایک اور صرف ایک۔ ظاہر ہے کہ ایسے جگت سنگیت کی اٹھان کیا ہو گی۔

کہا جائے گا کہ شاعر نے جو ترکیب اختیار کی ہے وہ اپنی جگہ بجا ہے۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ لیکن اس میں فیہ دو طرح نکلتی ہے۔ ایک یہ کہ اس طویل نظم کی لے دہی مثنوی معنوی

اور خود اقبال کی اپنی منظومات کی عام ہے جس سے ذہن قدرتی طور پر ان منظومات کی طرف لوٹتا ہے اور جو تمثیلی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اس میں ایک حد تک تناقض پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی سابقہ غنائی وضع ذہن پر حاوی ہو کر ڈرامائی وضع پر یقین میں خلل پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن نظم کو بجائے خود دیکھا جائے۔ اور یہی مناسب بھی ہے۔ تو پھر یہ احتمال دور ہو جاتا ہے۔

دوسرے زندہ رود کی آواز شروع سے آخر تک ایک ہی آواز ہے۔ ایک ہی لئے ایک ہی مضمون جسے بار بار دہرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہی ہادیانہ لے جو اقبال کی تمام مثنویات میں مشترک ہے، نظم کی تمثیلی وضع پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ غنائیہ راست لے ڈرامائی پیرائے میں دخیل ہو جاتی ہے۔ یہ شاعر کی مخصوص افتاد اور نظم کے خصوصی مقصد کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن شاعر کے حق میں اتنا یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اگر سلسلۂ حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے یعنی یہ دیکھا جائے کہ اسے اپنا منشاء ظاہر کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے اور کس وقت کیا بات کہنی چاہیئے تو معلوم ہوگا کہ اس نے بعینہٖ وہی قدم اٹھایا ہے جو اسے اٹھانا چاہیئے تھا۔ جوں جوں ہم اسکی طویل بحث و مباحثہ سے گذرتے جاتے ہیں اور غور کرتے ہیں تو یہ روش نظم کے لابدی تقاضوں کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ اس حد تک رعایت شاید بے جا نہ تصور کی جائے۔ فن کے لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے اعراض ممکن نہیں۔

نظم خواہ مختصر ہو یا طویل، اس میں وہ عنصر لازمی ہے جسے صناعی کہا جاتا ہے۔ یعنی نظم ایک بنیادی احساس سے کیسے ابھرتی ہے اور شاعر اسے کس طرح تشکیل دیتا ہے۔ اور اپنے تخلیقی

ملکات کو کام میں لاکر تکنیک اور بیان کے مسائل کیسے حل کرتا ہے۔ اس کی قوتِ شاکلہ کیسی ہے۔ الفاظ کے انتخاب سے لیکر تمثیلات، اسالیب اور طریقِ کار تک تمام امور ذہنی کارپردازی کے متقاضی ہیں۔ شاعر کا سلیقہ، اس کا ذوق، اسکی ہنرمندی، اسکی رسائی اندیشہ اپنی صناعانہ کارپردازیوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور انہی سے ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے فرق ظاہر ہوتا ہے۔

جاوید نامہ کو خواہ کتنی ہی کڑی نظر سے دیکھا جائے۔ اس میں بلاشبہ ایسے شواہد بکثرت ہیں جو ایک صبر آزما اور ہمت شکن مہم کے سرانجام کی خبر دیتے ہیں۔ شاعر جابجا ایسے پیرائے، واقعات کردار، تمثیلات اور طور و طریق اختیار کرتا ہے۔ اور ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جس سے اسکی طباعی اور آگاہی کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ اور ذہن پر ایک جلیل القدر شخصیت کا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہاں ایک نقاد کی اُس تعریض پر بحث کا موقع نہیں جو اس نے کومیڈی اور جاوید نامہ کا موازنہ کرتے ہوئے کی ہے۔ البتہ اتنا بیان کردینا ضروری ہے کہ دانتے اور اقبال کی طرح ان کی تصنیفات بھی اپنے اپنے دور کی پیداوار ہیں۔ اور ان میں وہی فرق ہے جو تیرھویں صدی اور بیسویں صدی میں ہے۔ ایک میں تطہیر پر زور دیا گیا ہے اور دوسری میں، جیسا کہ خود ایک مغربی نقاد نے کہا ہے۔ انسان (فرد و جماعت) کے ارتقا پر۔ جہاں دانتے کا سفر ختم ہوتا ہے وہاں سے زندہ رود کا سفر شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان تزکیۂ نفس کے بعد ہی کسی تعمیری و ارتقائی مہم کا آغاز کرسکتا ہے۔ اقبال کا مسئلہ طہارت کا مسئلہ نہیں بلکہ ارتقاء کا مسئلہ تھا۔ ان کا مقصد حیاتِ بعد الممات کی توضیح اور دوزخ، برزخ اور جنت کے مکینوں کی زندگیوں کو عبرت یا سعادت کا مرقع بنانا نہ تھا بلکہ ان امور کی نشاندہی

تھی جو حیاتِ دنیوی میں افراد اور اقوام کی بقا کا باعث ہوں۔ یہی کیفیت ان پیرایوں کی ہے جو دونوں نے اپنے اپنے مطمحِ نظر، بنیادی تقاضوں اور روایات کی مروجہ صورت کے مطابق اختیار کیے۔

جاوید نامہ نہ تو دانتے کی تصنیف کا جواب ہے نہ اسکی صدائے بازگشت۔ نہ نقل نہ مثنیٰ، ہاں اس کا تصور کرتے وقت دانتے کی تصنیف ضرور پیشِ نظر تھی۔ جس طرح وہ تمام تصنیفات جو خود دنیائے اسلام میں اس موضوع پر تحریر ہوئیں۔ اس سے قطع نظر ہر تخلیق اپنا پیکر خود تراشتی ہے۔ اور وہی اس کا قدرتی، حقیقی اور زندہ پیکر ہوتا ہے۔

اس تمام بحث کے بین السطور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ اقبالؔ کا سروکار ماضی حال، مستقبل سب سے ہے۔ وہ ایک ایسی ترسیلی تنصیب ہے جو ماضی سے روایات و اثرات کی برقی رو کو اپنے اندر سمو کر اسے اپنی اور اپنے دور کی برقی لہر سے تیز تر اور قوی تر بنا کر مستقبل کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ یہ ان کی تین بڑی بڑی جہتیں ہیں جو قدرتی طور پر جاوید نامہ کو بھی مختلف پہلوؤں، مختلف جہتوں، مختلف سمتوں اور بُعدوں کی تصنیف بنا دیتی ہیں۔ اگر ہم ان مسائل، حکایات، مقولات و اشعار، آثار و اخبار، روایات اور معلومات کو پیشِ نظر رکھیں جو ان کے شعور میں مستحضر تھیں تو یہ بجائے خود ایک جاودانی عنصر ہے جو چونا گچ ہو کر ان کی تعمیر کا مستقل جزو بن گیا ہے۔ جوں جوں ہم اپنے ورثۂ ماضی (شرقی و غربی) کا جائزہ لیں، اس نورانی غبار کے بیشمار ذرات فراہم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ حفریات اسقدر دلچسپ ہیں کہ ان سے ایک عظیم عجائب خانہ قائم ہو سکتا ہے۔ اقبال نے جتنے بھی مسائل چھیڑے ہیں وہ تاریخ میں کبھی نہ

کبھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ مثلاً امام اعظم کا زیادتیٔ ایمان کے بارے میں قول، تقلید کی مذمت (فیضی : آزادگی ز قید تقلیدم بخش)، اجتہاد (رنگ و بے رنگی (رومی و غالب)، ذات و صفات (معتزلہ و اشاعرہ)، ابلیس، انسانِ کامل (یزداں بکمند آور)۔ عبدہٗ (جیلی)، عالم یا آفاق کا مومن میں گم ہونا (سرمد گوید فلک بہ احمد در شد)، "دبستانِ مذاہب" میں مختلف مذاہب، ادیان اور فرقوں کے مابین خیالی مباحثہ، سوال و جواب (محمود شبستری۔ چندر بھان: "مکالمۂ دارا شکوہ و بابا لال"، لاتسب الدہر (نغمہ ام در گوش کن اے مرد راہ۔ لاتسب الدہر بر خواں رمز شاہ: بیغمؑ)، زمان و مکان (غالب: زمان و مکاں را ورق در نورد، عرفی: تو ایں معنی کجا یابی کہ ہستی در زماں بینی) دو باتیں خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ اقبال نے ابلیس کو خواجۂ اہلِ فراق قرار دیا ہے۔ یہ تاریخِ اسلام میں بعض افراد کا اہم تصور رہا ہے۔ چنانچہ خود اقبال خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

> "حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن؟ میرے نزدیک گستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سر الوصال کا خطاب دیا تھا تو میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے سر الفراق کہا جائے۔"

جیسا کہ شیخ محمد اکرام مرحوم نے "رودِ کوثر" میں کہا ہے: سر الوصال شانِ جمالی ہے اور سر الفراق شانِ جلالی۔ ایک وحدت الوجود اور دوسرا وحدت الشہود۔ بقول نواب سر احمد حسین نظام جنگ، ایک کے

تصوف کا رجحان سکون اور وصل کی طرف ہے اور دوسرے کا جوش اور عشق کی طرف ۔

منزل کبریا کا تصور جو انسانِ کامل اور معراج کی شکل میں معروف ہے، اقبال کا ہمیشہ کلیدی تصور رہا ہے جس کا وہ مختلف پیرایوں میں بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ معراج کے متعلق ایک سیر حاصل کتاب لکھنا چاہتے تھے جو بلاشبہ نہایت بصیرت افروز ہوتی لیکن اسکی حیثیت تمام تر علمی ہوتی۔ زیادہ دلنشیں اور موثر پیرایہ ادبی ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اسکی وضع زیادہ عالمگیر ہے اور اقبال کا خطاب خاص و عام سب سے تھا۔ اگر ایسی پیشکش ادبی ہوتے ہوئے افسانوی بھی ہو جس میں قوائے تخلیق، بالخصوص تخیل کو وسیع جولاں گاہ ہاتھ آتی ہے۔ تو اس میں وہ تمام جوہر مجتمع ہو جاتے ہیں جو اس کی ابدیت کے ضامن ہوں۔ جاوید نامہ کی جاذبیت، شہرت، قبولیت اور عظمت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ انہی کی بدولت اس طریۂ مشرق میں وہ لطافت ذوق، آب و رنگ اور تخلیقی شان پیدا ہو گئی ہے جو اس کو فکر و فن کا دو آتشہ بنا دیتی ہے اور جس کی کیف انگیز سرمستیاں ہمیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔

تحقیق کا سلسلہ اور آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ عرفا و حکما نے ہر مسئلے کے بارے میں جو نکات بیان کئے ہیں اقبال ان سے باخبر ہیں۔ اور ان کی ذہنی دنیا انہی سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو ہمیں ان کو درست طور پر سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً خلیفہ عبدالحکیم نے رومی اور اقبال کی جس ACTIVISM کا ذکر کیا ہے وہ حرارت ایمانی کے سوا اور کیا ہے جو صوفیائے کرام اور ان میں مشترک ہے؛ چنانچہ اہلِ نظر نے عطار، رومی، حافظ، نظیری، عرفی (اور اکبری دور

کے دیگر شعراء بیدل اور غالب سب میں اسکی نشان دہی کی ہے۔ یہ اسلئے ہے کہ روحانیت فی نفسہٖ فعال اور متحرک ہے۔ اور صوفیاء اور اقبالؔ دونوں کا حقیقی مقصود یہی ہے۔ اقبال کو ماضی سے بے نیاز مستقل اکائی تصور کرنے میں شدید مغالطوں کا احتمال ہے جس کا سبب اصطلاحات کے ظاہری و حقیقی معنوں میں بنیادی فرق ہے۔ اگر ان کا محتاط تجزیہ کیا جائے یا شرح کر دی جائے تو اقبال کا حقیقی موقف صاف واضح ہو جاتا ہے اس تشریح کی کیفیت حسب ذیل ہے :-

خودی کبریٰ ، منزل کبریا	خدا ، اللہ ، حق ، ذات بحت
خودی	نفس بلکہ روح
دل	روح
عمل	عمل صالح ، ایمان ، عرفان ، شریعت و طریقت
عشق	روحانی شوق
آرزو	روحانی ذوق و شوق ، عقل و علم دونوں روحانیت کے تحت ، ادب خوردۂ دل
مقاصد	روحانی مقاصد
دید جمال ذات ، تخلقوا باخلاق باللہ	فنا فی اللہ
عبدہٗ ، انسان کامل ، معراج	بقا باللہ
انسانیت کبریٰ	انبیاء عبدہٗ اولیاء ، اوتاد ، اقطاب ، ابدال ، قیوم

ث ث ث

انداز — روحانی انداز - مادیت زیر تحت روحانیت (جو در حقیقت روحانیت ہی ہے)

تسخیر کائنات — دنیاوی حیثیت سے علم و حکمت کے ذریعے لیکن بالآخر روحانی فرماں روائی اور تکوینی نظام پہ قدرت

اقبال کے یہاں اول تا آخر معراج کا تصور غالب رہا ہے۔ وہ رفعتوں کے شیدائی ہیں۔ شاید یہ ان کے مولد و منشا ہی کا اثر تھا (جس میں ہمالیہ ایک عظیم الشان برفانی فصیل کی طرح نمودار ہوتا ہے) کہ ان کی پہلی نظر اس برف پوش سلسلۂ کوہسار پہ پڑی۔ اور پھر بلندئ افلاک پہ جہاں آفتاب و ماہتاب، ستارے اور کہکشائیں ہیں۔ اور ازاں بعد ماورائے سماوات پہ۔ معراج کا احساس ان کے یہاں رہ رہ کر ابھرتا ہے :-

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — بانگِ درا

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں — بالِ جبریل

یہی رفعت کی تمنا تھی جس نے جاوید نامہ میں بالآخر سیاحتِ علوی کی شکل اختیار کی جو تصورِ معراج کا سب سے مبسوط اور نمایاں اظہار ہے۔

خ خ خ

جاوید نامہ ایک نورانی حقیقت" کا "رنگین شعبدہ" ہے جس کے بعض شہپارے نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر اس کا ہر جائزہ نا تمام رہے گا۔ ہر ناظر انہیں بمجرد نظر شناخت کر سکتا ہے۔ ہمارا مطلب ان مرقعات سے ہے جو زروان، افرنگیں، طواسین، ابلیس، نبیۂ مریخ اور مقبرۂ شرف النساء سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں اختراع و ایجاد کو خاص طور پہ دخل ہے۔ تخلیقی ندرت کشمرود، خافطین، یلدرم، ہفت مرگ اور مرغدین میں نظر آتی ہے۔ ایسے نوادر بیک وقت تقدیم و فیضان بھی ہیں اور وہ دریافت و انکشاف بھی جن سے حیات اور فکر و نظر کے نئے نئے روزن وا ہوتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ان میں بیشمار باریکیاں نظر آئیں گی جو ایک جہان کے اندر کئی کئی جہانوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی بنا پہ اگر جاوید نامہ کو تہذیب و ثقافت، رجال و افراد اور وقائع و حوادث کے بوقلموں عناصر کا خوان الوان یا تاریخی دستاویز قرار دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس پہ عبقریت ایک طیلسانِ کیف و رنگ بنکر چھائی ہوئی ہے جو شاعر کی شگرفیٔ طبع سے از خود ابھرتی ہے اور گوناگوں فکری، تہذیبی، مذہبی، سری، عرفانی اور فنی و جمالیاتی عناصر کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔ یہ ہمہ بینی، ہر سونگر تجسس اور ہر سو خرام جولانیٔ طبع ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اور اپنی جادو اثری کا سے حیات میں نشوونما کی بیش از بیش صلاحیتیں پیدا کرتی ہے۔ ایسے کہ وہ رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جائے اور تمام انسانیت کے لئے بانگِ رحیلِ کارواں ثابت ہو۔

یہی خصوصیات ہیں جنہوں نے مجھے اس تصنیف کو اردو میں پیش کرنے کی تحریک دلائی۔ سوال یہ تھا کہ اس کو اردو میں پیش کیسے کیا جائے۔ آیا اسے پیش بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ فارسی اردو

کے سانچے میں ڈھل کر اپنے خط و خال کی رعنائی کھو بیٹھتی ہے۔ کم از کم سابقہ تجربوں سے یہی ثابت ہوتا ہے اور جاوید نامہ کی دشواریاں تو اس کی مخصوص وضع کے باعث بدرجہا زیادہ ہیں۔ اول اسکی مختصر بحر اردو کے لئے بہت تشنہ ثابت ہوتی ہے اور محض اس کا پیرہ ہی پیش کر پاتی ہے۔ بلکہ اصل میں بھی کیف و رعنائی کے باوجود گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں اقبال کی بے کم و کاست حقیقت نگاری کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ فلسفے کی گرانباری اور ناصحانہ لہجہ کلام پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

دوسرے، پابند اصناف، خصوصاً غزلوں سے عہدہ برآ ہونا بے حد صبر آزما تھا۔

تیسرے، ہیئت میں اصل کی پیروی کی جائے تو آزادی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور انحراف کیا جائے تو اور بھی پیچیدگیاں رونما ہوتی ہیں۔ غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را! یوں بھی فارسی اردو سے اسقدر قریب ہے کہ وہ بجنسہٖ اردو میں در آتی ہے اور سرے سے ترجمہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پھر وفاداری کا سراب یعنی متن کی ظاہری وضع سے قریب تر رہنے کی کوشش اور بھی گمراہ کرتی ہے۔ وفاداری کا تقاضا قابلِ فہم ضرور ہے لیکن اس پر اصرار ترجمہ کے بہترین مقاصد کے منافی ہے۔ مترجم ہو یا ادیب دونوں اپنی اپنی جگہ خالق ہیں۔ پھر ایک کی خودی دوسرے پر حاوی کیوں ہو؟ ترجمہ میں بھی تخلیق کی راہ بند نہیں اور نہ ہونی چاہئے۔ اپنی خودی، اپنے ذوق، اپنے شعور اور جوہر تحریر کی حد تک مترجم بھی آزاد ہے اور اصل کے متوازی اپنی شخصیت پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی بھی مصنف ہو اس کی تصانیف کو اس انداز ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اصل کے ساتھ وفاداری کو جزوِ ایمان یا طوقِ گلو نہ بنایا جائے۔ بظاہر یہ آن ہونی سی بات ہے لیکن فی الحقیقت اصل مصنف اور اسکی تحریر سے

جس قدر آزادی اختیار کی جائے ترجمہ اتنا ہی کامیاب ثابت ہوگا۔ ترجمے کا تصور یہ ہونا چاہیئے کہ اصل کی روح کشید کی جائے، مغز نہ کہ پوست۔ روحِ معنی (بین السطور) احساس، تخیل، ذوق، علائم، اشارات وکنایات، ثقافت، زندگی، کلچر) نہ کہ کسوتِ خارجی۔ بالفاظ دیگر اصل کو حقیقتہً حاصل کیا جائے۔ اسی دوری میں قرب ہے۔ ترجمے میں ہماری ذات لازماً منعکس ہوگی۔ کہیں کم درجے پر کہیں برابر، کہیں پیش پیش۔ مصنف کے دوش بدوش رہ کر تخلیق کو فوقیت دینے سے ترجمانی کا حق ادا کرنا ممکن ہی نہیں یقینی ہوگا۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں: تقلید۔ از طاق بادہ گیرم و در ساغر افگنم۔ یا تخلیق۔ بگدازم آبگینہ در ساغر افگنم۔ پہلا راستہ حقیقی قرب کے بجائے بعد کا راستہ ہے کیونکہ آبگینے کو گداز کرنے کے ساتھ بادہ کو بھی از سرِ نو کشید کرنا پڑتا ہے۔ اور اس میں ذوق وفن کی ایسی ہی صلاحیتیں کام آتی ہیں جیسی تخلیق اولیٰ میں کام آئیں۔ اس سے ترجمہ کی ایک خاص روش اپجتی ہے جس سے اس کی امتیازی حیثیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور اصل کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

میں نے ترجمے کی پہلی روش اختیار کی ہے۔ اور اس کی بنا پہ اصل کی چھ رکنی مختصر بحر کے بجائے سالم بحر اختیار کی ہے جس میں فشار کے بجائے کشادگی ہے اور وسعتِ بیان کی گنجائش کہیں زیادہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تخلیق کو پیش کرنے کے لئے سالہا سال کی کاوش درکار ہے۔ بعض مقامات، یہاں تک کہ مصرعوں اور اشعار کو بھی مناسب سانچے میں ڈھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اور

اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں نقشِ ثانی مترجم کی شوخیٔ تحریر کا فریادی نہ ہو۔ ان حالات میں عدم اطمینان لازم ہے جس سے ذہن آخری وقت تک رہا نہیں ہو سکتا۔ یہی احساس تھا جس کے باعث بار بار ردوبدل سے کام لینا پڑا۔ یہاں تک کہ بعض حصے یک قلم تبدیل کر دیے گئے۔ تاکہ وہ بے ساختگی و برجستگی اور حسن و لطافت پیدا ہو سکے جو ادب کی روح رواں ہے اور تحریر کو صحیح معنوں میں انشائے لطیف بناتی ہے۔

جاوید نامہ کا سب سے کٹھن مسئلہ غزلیات اور بندات سے متعلق ہے۔ جن کی سنگین پابندی کے باعث مترجم کو لامحالہ جنگ مغلوبہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان حالات میں گریز شاید قرین مصلحت ہو یعنی بعض حصوں خصوصاً غزلیات کو بجنسہٖ پیش کر دیا جائے۔ یہ درحقیقت اعترافِ شکست ہے۔ میں نے ایسے فن پاروں پر بار بار غور کیا ہے اور ان کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پے در پے اصلاح و تہذیب کے بعد دونوں اطراف اصل اور ترجمہ کا توازن بڑی حد تک یکساں ہے اور جن مقامات کی طرف ڈاکٹر عبداللہ نے اشارہ کیا ہے ان کی کیفیت معتدبہ حد تک بدل گئی ہے۔

اصل کا حق کہاں تک ادا ہوا اس کا اندازہ جستہ جستہ مقاموں ہی سے ہو سکتا ہے:۔

رود کاویری یکے نرمک خرام	رود کاویری نہ ہو سیماب پا آہستہ چل
خستہ شاید کہ از سیر دوام	چلتے چلتے تھک گیا ہے تو ذرا آہستہ چل
موج مضطر خفت بر سنجاب آب	موج مضطر سوئی پانی کی سمور سیج پہ
با دل خود گفتگو ہا داشتم	اپنے دل سے والہانہ گفتگو پہ گفتگو
آرزو ہا جستجو ہا داشتم	آرزو پہ آرزو اور جستجو پہ جستجو!

بحر و ہنگام غروبِ آفتاب
دور تک نیلاب ہی نیلاب کی موجیں رواں

نیلگوں آب از شفق لعلِ مذاب
انمیں لالی سے شفق کی پگھلے لعلوں کا سماں

از خدا کم خواستم طولِ حیات
میں نے کب مانگا خدا سے طول دوران حیات

رومی کی ساری غزل کی طرح تو زیادہ جاذب تو یہ ہے :۔

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست
ہونٹوں سے گھول رس مزہ ساماں کہیں جسے

بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
چہرہ دکھا کہ رشکِ گلستاں کہیں جسے

ایں آب و نان چرخ چو سیل است بے وفا
ماہی ہوں آب و نان فلک مجھ کو دے عار

من ماہیم نہنگم و عمانم آرزوست
میں اور نہنگ زار کہ عماں کہیں جسے !

ایک اور محل جہاں دشوامترِ ٹھیٹھ ہندی لہجہ میں کھشرود کہتا ہے، زیادہ دلچسپ ہے۔ اسی کے آگے یوسف کا نام اس کے لئے بدیسی بھی ہے اور انجانا بھی۔ اسی لئے اس کی جگہ "بھیو شبھ" لایا گیا ہے جو صوتی حیثیت سے یوسف کے قریب ہے اور ان کی فضیلت بھی واضح کرتا ہے۔ تخلیق اور ذوقِ فن کا یہ عنصر ساری نظم میں برقرار رکھا گیا ہے۔

ترجمہ ایک سلسلۂ جاریہ ہے جس میں مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ منزل سے ہمکنار ہونے کے بعد بھی نظرِ بازگشت کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اور نظیری کا ہمنوا ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ :۔

بازمی باید ز سر گیرم رہِ پیمودہ را۔ پیرایۂ اظہار کو زیبا تر بنانے کی سعیٔ مسلسل میں احباب کے گراں قدر مشورے بھی بہت فائدہ مند ثابت ہوئے۔ ان میں پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر عابد،

سید شبیر کاظمی اور ڈاکٹر سید عبداللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں ان کے پر خلوص تعاون کا بیحد شکر گذار ہوں۔ ڈاکٹر عبداللہ کا شمار خاصانِ ادب ہی نہیں انتقاد کے یکہ تازوں میں بھی ہے۔ انہوں نے جس پیرائے میں ترجمے پر مدلل و مبسوط بحث کی ہے اور تخلیقِ ثانی کو تخلیقِ اولیٰ کا ہمدوش قرار دیا ہے، وہ اس صنف کی دادرسی کی بے نظیر مثال اور ادب کی نہایت گراں بہا خدمت ہے۔ علاوہ بریں انہوں نے چند ہی سطور میں جاوید نامہ کے مقام اور نکات پر جو روشنی ڈالی ہے وہ ماورائے تحسین ہے۔ صرف ایک ہی ترکیب "کثیر الالوان" کسقدر نقش ہائے رنگا رنگ پر محیط ہے! ایسی بلیغ ترکیب بجز بیک وقت اس کی اولیں تمثیل بھی ہے اور آخری تمثال بھی۔

میں نے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر محمد معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈیمی کو اس کتاب کے سلسلے میں جو زحمتیں دیں ہیں اور انہوں نے ان کو جس خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے، اس کے لئے میرے دل میں انتہائی قدر ہے۔ انہوں نے بلا شبہ رہ و رسمِ آشنائی کا حق ادا کرتے ہوئے اسے نیا مفہوم عطا کیا ہے۔

اقبال کی اس زندۂ جاوید تصنیف کے شایانِ شان دلآویز نقش تیار کرنے کا شرف پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر مسٹر آذر ذوبی کو حاصل ہے جنہوں نے اس کو میری فرمائش پر انتہائی عجلت سے تیار کیا۔

اپنے محترم بزرگ سید عبدالواحد صاحب، جو اقبالیات میں عالمی شہرت رکھتے ہیں، کا بھی ان کی کرم فرمائیوں کیلئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

۳۲/۲ سی۔ پی ای سی ایچ ایس کراچی
۱۴ اگست ۱۹۷۵ء

رفیق خاور

میری نگاہوں نے دیکھا ہے پھیلے نیلمبر کا سماں
کبھی بہ ہالۂ ماہ نشیمن کبھی بہ شاخِ کاہکشاں
یہ دنیا گہوارہ اپنا ایک ہی معمورہ تو نہیں
ہر اک تارا ایک جہاں ہے یا وہ رہا ہے ایک جہاں

یا فتاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ستار الامر

مُناجات

یہ جہانِ بے کراں یہ کائناتِ رنگ رنگ
آدمی ہر دم یہاں گرمِ فغاں ہے مثلِ چنگ

آرزوئے ہم نفس کچھ اسقدر ہے جانگداز
لاتی ہے اس کے لبوں پر نالہ ہائے دلنواز

بس کہ اس عالم کی ہستی کچھ نہیں جز آب و گل
کیسے کہہ سکتے ہیں پنہاں اسکے سینے میں ہے دل

بہرے اور خاموش ہیں صحرا و بحر اور کوہ و کاہ
ساکت و صامت سپہرِ نیلگوں اور مہر و ماہ

ہیں بہم گرچہ ستارے ہی ستارے چرخ پر
سب کے سب اک دوسرے سے بڑھ کے تنہا ہیں مگر

خود ہماری ہی طرح بے چارہ ہر سیارہ ہے
آسماں کے نیلگوں میدان میں آوارہ ہے

کارواں بے راحلہ، بے راہبر، بے برگ و ساز
بیکراں پہنائیِ افلاک اور راتیں دراز

کیا کوئی صیاد ہیں ہم اور یہ دنیا شکار؟
یا ہیں صید از یادرفتہ کسمپرسی کا شکار؟

کون ہے جو ابنِ آدم کا یہاں دمساز ہو
اس کی فریاد و فغاں پر گوش بر آواز ہو

یہ نظر آتا ہے جو روئے جہانِ چار سُو
جس کے پرتو سے فروزاں ہے یہاں کا کاخ و کُو

ایک سیارے کی گردش ہی پہ ہے اسکا مدار
لمحہ بھر ہے آب و تاب اس کی فقط مثلِ شرار

اے خوشا وہ روز جو ہو مادرِ ایام سے
صبح ہو آزاد جس کی دوپہر اور شام سے

روشن اسکے نور سے ہو جائے گر روحِ رواں
ہو صدا بھی رنگ کی صورت نگاہوں پر عیاں

غیب ہو جاتا ہے اسکی تاب سے عینِ حضور
اسکی نوبت جاودانی، لازوال اور بے مرور

اے خدا مجھ کو عطا فرما دے وہ تابندہ روز
اور بچا اس روز سے جسمیں نہیں کوئی بھی سوز

آیۂ تسخیر[1] کس کی شان میں نازل ہوئی؟
کس سے ہے حیرت زدہ یہ گنبدِ نیلوفری؟

علّم الاسماء[2] کے نکتے کا شناسا کون تھا؟
کون تھا ساقی سے مست اور مستِ صہبا کون تھا؟

جملہ موجودات سے وہ کون تھا جس کو چنا؟
کُل جہاں سے محرمِ رازِ دروں کس کو کیا؟

اے کہ تیرے تیر ہی نے سینوں کو گھائل کیا
صرف اُدعُونی[3] کہا تھا کس نے اور کس سے کہا؟

میرا قرآں، میرا ایماں، تیرا روئے دلستاں
تیرے جلوے سے رہے محروم پھر بھی میری جاں

کم کہاں ہوں مہرِ عالم تاب کی تابانیاں
گرچہ ہو اس کی شعاعوں پر شعاعوں کا زیاں

---

[1] سورہ قرآن (۱۴ - ۱۳) وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والنجوم مسخرات بامرہ (اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر بنایا اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں) [2] قرآن (۲ - ۳۱) علّم الاسماء کلہا (اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو سب نام چیزوں کے) [3] قرآن (۴۰ - ۶۰) قال ربکم ادعونی استجب لکم (تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو تو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا)

عہدِ حافظ کو خرد کی الجھنیں زنجیرِ پا
ہے کوئی عالم میں مجھ سا بھی سکوں ناآشنا

مدتوں رہتا ہے اپنے گرد سرگرداں وجود
پھر کہیں ہوتی ہے روحِ ناشکیبا کی نمود

تو نہ مانے گر برا کہدوں یہ خاکِ شورہ زار
بہرِ تخمِ آرزو ہرگز نہیں ہے سازگار

اس خرابے سے تو اتنا بھی غنیمت ہے کہ یاں
آشکارا ہو کسی صورت میں اک جانِ تپاں

تو ہے میرا چاند، میرے کلبۂ احزاں میں آ
کسقدر ظلمت ہے میرے نفس کے زنداں میں آ

شعلۂ سوزاں کو پروائے خس و خاشاک کیوں
کوندنے گرنے سے ہو برقِ تپاں کو باک کیوں

زندگی بھر میں رہا اندوہِ فرقت سے فگار
اب خدارا اک جھلک اس گنبدِ مینا کے پار

کھولدے سب بند دروازے دلِ بیتاب پر
قدسیوں کی رازداں ہو جائے تا خاکِ بشر

تجھ سے میرے دل میں ایسی آتشِ سوزاں جلے
پھونکدے جو خار و خس کو، عود باقی بچ رہے

اور پھر اس عود کو رکھدے سرِ نارِ تپاں
اور پھیلا دے جہاں میں چار سو اس کا دھواں

میرے پیمانے کی آتش کی حرارت تیز کر!
کچھ تغافل میں نگاہِ التفات آمیز کر!

ڈھونڈتے ہیں ہم تجھے اور تو کہیں نظروں سے دور
یوں نہیں، ہم بے بصر ہیں اور تو سر تا پا حضور

یا اٹھادے سامنے سے پردۂ اسرار کو
یا اٹھالے اے خدا اس جانِ بے دیدار کو

برگ و بر سے نا امید افکار کا میرے نہال
یا اسے شاداب کر دے یا تبر سے کاٹ ڈال

تو نے بخشی ہے خرد، اب بخشدے ذوقِ جنوں
جذبِ باطن کے سزاوار و کیف کا مشتاق ہوں

علم کا مسکن ہے پنہاں خلوتِ افکار میں
عشق کا کاشانہ روشن دلِ بیدار میں

علم کو گر عشق سے حاصل برومندی نہیں
جز تماشا خانۂ افکار وہ کچھ بھی نہیں

یہ تماشا خانۂ افکار سحرِ سامری
کاوشِ افکار ہے اس کیلئے مرگ آفریں

بے تجلی مردِ دانا راہ پا سکتا نہیں
عقل مہجوری سراسر، دیں ہے مجبوری تمام

بے تجلی زندگی اپنی ہے آزارِ دوام
ہم ہیں خوانِ نظر، اس کا سر و ساماں خبر

بزمِ ہستی جلوہ زارِ کوہ و دشت و بحر و بر
پھر سپردِ ماہِ تاباں کر دے اس مہ پارہ کو

ہو کوئی منزل عطا یارب دلِ آوارہ کو
داستاں دردِ جدائی کی نہیں ہوتی تمام

میری مشتِ خاک ہے ہر چند سر تا پا کلام
پھر ذرا کہدے فرازِ عرش سے اِنّی قریب[1]

زیر گردوں کسقدر تنہا ہوں میں، کتنا غریب
کیا شمال اور کیا جنوب، ان سے میسر ہو نجات

ڈوب جائیں تا مثالِ مہر و مہ سارے جہات
چاند، سورج اور ثریا سب کو پیچھے چھوڑ دوں

یہ طلسمِ دوش و فردا بے محابا توڑ دوں
اس حیاتِ دنیوی سے چند دم وابستہ ہیں

تو ہے تابِ جاوداں اور ہم شرارِ جستہ ہیں
رشک ہے یزداں پہ بھی اس کو یہ ہے انسان کیا!

تو کہ ہے پیکارِ مرگ و نیست سے نا آشنا
اسکو خلوت میں ہے راحت اور نہ جلوت میں سرور

یہ جو بندہ ہے ترا آفاق گیر اور نا صبور
یہ زمینی آسمانی ہو بلطفِ سرمدی

میں ہوں فانی اے خدا مجھ کو بنا دے دائمی

---

[1] قرآن (۲ - ۱۸۶) واذا سالک عبادی عنّی فانی قریب (اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں کہاں ہوں) تو آپ فرما دیں کہ "میں ان کے قریب ہوں"۔

نطق میں، کردار میں مجھ کو عطا ے ضبط کر
راستے موجود ہیں، دے مجھ کو توفیقِ سفر

زمزمہ پیرا ہوں جس کا وہ جہاں ہی اور ہے
جس سے اُترا یہ کلام اک آسماں ہی اور ہے

میں ہوں بحرِ بیکراں، آشوب میں لا انتہا
اس کی تہہ میں غوطہ زن ہو کون ہمت آزما

اک خدائی گو ہوئی آ کر یہاں ساحل نشیں
کچھ مگر جز موجۂ آبِ رواں دیکھا نہیں

عالمِ امروز میں نو میدِ اربابِ کہن
دورِ آئندہ کی جانب ہے مرا روئے سخن

نوجوانوں پر مرا بارِ سخن آسان کر
سہل ہو اس قلزمِ زخار سے ان کا گذر

تمہیدِ آسمانی

رمزِ ازل آسمان کی زمین پر طعنہ زنی

زندگانی غائب و حاضر کی حس سے بے قرار
ہوگئی صورت گرِ دنیائے ناپیدا کنار

عشق نے یوں شیرازۂ تارِ نفس برہم کیا
نقشِ حیرت خانۂ ایام کا پیدا ہوا

ہر طرف جوشِ و خروشِ ذوق و شوقِ خودگری
ہر زباں پہ نعرۂ من دیگرم تو دیگری

کار فرما چاند تاروں میں ہوا ذوقِ خرام
تھا فضاؤں میں چراغاں ہی چراغاں صبح و شام

خیمۂ زربفت گاڑا مہرِ عالمتاب نے
وہ طنابوں کے روپہلے جال بکھرائے ہوئے!

ہوگئی صبحِ ازل چرخِ بریں پر آشکار
اپنے سینے سے لگائے یہ جہانِ تازہ کار

ملکِ آدم یہ زمیں کیا تھی فقط ویرانہ تھا
جس کے صحراؤں میں کوئی بادیہ پیمانہ تھا

کوہساروں سے نہ کوئی آبجو گرمِ ستیز
اور نہ صحراؤں میں متوالی گھٹائیں قطرہ ریز

شاخساروں میں نہ مرغانِ خوش الحاں کی نوا
اور نہ میدانوں میں آہو کا خرامِ دلربا

جلوۂ باطن سے بے بہرہ سمندر ہوں کہ بن
پیچ و خم کھاتا دھواں تن پر ڈھلکتا پیرہن

سبزہ اس کی گود میں بیگانۂ بادِ بہار
خواب میں کھویا ہوا، بطنِ زمیں میں سوگوار!

پیرِ گردوں نے زبانِ طعن کی اس پر دراز
تجھ سے بڑھ کر کون ہے دنیا میں مجبورِ نیاز

کون پہنائی میں میری تجھ سا محرومِ بصر
جز مری قندیل کے حاصل بھی ہے تابِ نظر

گر زمیں الوند بھی ہو جائے پھر بھی ہے زمیں
روشن اور پائندہ میری طرح ہو سکتی نہیں

زندہ رہنا ہے تو رہ با برگ و سازِ دلبری
ورنہ پھر جا ڈوب مر رسوائے داغِ کہتری

ہو گئی شرمندہ و مایوس یہ سن کر زمیں
کر دیا گردوں کے طعنوں نے اسے اندوہگیں

درد بے نوری کی ایسے پیشِ حق فریاد کی
اس طرف افلاک سے آئی ندائے سرمدی

اے امیں جس کو نہیں اپنی امانت کی خبر
اس قدر غمگیں نہ ہو، ڈال اپنے باطن پر نظر

زندگی کی ہاے و ہُو سے اس کے دن میں آب و تاب
یہ کہاں آفاق کی اس روشنی سے فیض یاب

صبح کی تنویر فیضِ آفتابِ داغ دار
اور نورِ جاں ہے آزادِ غبارِ روزگار

نورِ جاں بے جادہ اپنی تاب سے گرمِ سفر
مہر و مہ کی تیز رو کرنوں سے صدرہ تیز تر

کیا مٹا ڈالا ہے لوحِ دل سے نقشِ امید کا؟
نورِ جاں ہو گا تری ہی خاک سے جلوہ نما

عقلِ انسانی کا شبخوں عالمِ موجود پر
عشق کی شوریدگی سے لامکاں زیر و زبر

اس کی فکرِ راہ داں ہے جادہ پیمائے دلیل
چشمِ بینا عشق کی بیدار تر از جبرئیل

خاک ہے لیکن ملائک سے بھی بڑھ کر تیز بال
آسماں ہے راہ میں اس کی سرائے کہنہ سال

اس کو آساں ہے فلک کا پار کرنا اس طرح
پرنیاں سے نوکِ سوزن کا گذرنا جس طرح

دُور کر دیتا ہے سارے داغِ دامانِ وجود
گر نہ ہو اس کی نظر، تاریک ہو بزمِ شہود

گو نہیں ہے طاعت اس کا شیوہ اور خونریز ہے
پھر بھی بہرِ توسنِ ایام وہ مہمیز ہے

اس کی آنکھوں کو جلا دیتی ہے بزمِ کائنات
تا کہ ہو اسکی نظر بینائے ذات اندر صفات

جو بھی عاشق جلوۂ حسنِ الٰہی پر ہوا
جملہ موجوداتِ عالم پر ہوا فرماں رُوا

نغمۂ ملائک

ملائک سے یہ مشتِ خاک بڑھ کر ضوفشاں ہو گی
زمیں انساں کے جلووں سے حریفِ آسماں ہو گی

جو تخیل اس کی پروردہ ہے طوفانِ حوادث کی
وہ گردابِ سپہر نیلگوں سے بیکراں ہو گی

تو خود معنائے آدم دیکھ مجھ سے پوچھتا کیا ہے
تڑپ دل میں ہے جسکی وہ نوا الدن عیاں ہو گی

یہ مضمونِ پیشِ پا افتادہ موزوں اس طرح ہوگا
کہ ہر ہر رگ دلِ یزداں کی اس سے خوں چکاں ہوگی

تمہیدِ زمینی

(حضرت رومی کی روح ظاہر ہو کر اسرارِ معراج بیان کرتی ہے)

عشقِ شوریدہ گریزاں کاخ و کوئے شہر سے
شعلہ بجھ جاتا ہے اس ہائے و ہوئے شہر سے

پھر خلوت ڈھونڈتا ہے یا وہ دشت و کوہسار
یا کوئی دامن لبِ دریائے ناپیدا کنار

محفلِ یاراں میں جب پایا نہ کوئی دل کا ساتھ
میں نے ڈھونڈا چند لمحوں کیلئے ساحل کا ساتھ

دور تک نیلاب ہی نیلاب کی موجیں رواں
اٹھیں لالی سے شفق کی پگھلے لعلوں کا سماں!

کور چشموں میں بھی یہ پیدا کرے ذوقِ نظر
بخشتی ہے بکہ یہ لو شام کو رنگِ سحر

والہانہ اپنے دل سے گفتگو پر گفتگو!
آرزو پر آرزو اور جستجو پر جستجو!

آئی ہوں میں جاوِدانی سے سراسر بے نصیب
زندہ ہوں اور زندگانی سے سراسر بے نصیب

چشمے ہی چشمے رواں اور دُوراں سے تشنہ کام
آپ ہی آپ آگیا لب پر یہ مستانہ کلام

غزل

ہونٹوں سے گھول رس مزہ ساماں کہیں جسے
چہرہ دکھا کہ رشکِ گلستاں کہیں جسے

اک ہاتھ جامِ بادہ ہو، اک ہاتھ زلفِ یار
وہ رقص ہو کہ نادرِ دوراں کہیں جسے

کہنا ترا یہ ناز سے مت چھیڑ باز آ
ہائے یہ فقرہ نیشترِ جاں کہیں جسے

اے عقل ہاں بہ شوق پراگندہ گو ہو تو
کر عشق تو وہ فکرِ پریشاں کہیں جسے

مچھلی ہوں آب دانِ فلک سیلِ بے وفا
میں اور نہنگ زار کہ عماں کہیں جسے

فرعون کے ستم سے ہوں محزوں کہاں وہ نور
تابِ درونِ موسیٰ عمراں کہیں جسے

کل شیخ پھر رہا تھا دیالے کے شہر میں
شاید کہیں ملے کوئی انساں کہیں جسے

ہوں سست رگ رفیقوں سے بیزار وہ کہاں
شیرِ خدا و رستمِ دستاں کہیں جسے

کی جستجو بہت مگر آساں نہیں سراغ
بولا طلب ہے اسکی نہ آساں کہیں جسے (رومی)

موجِ مضطر سوئے پانی کی سموری سیج پر
ہو گیا روشن افق تاریک سورج ڈوب کر

شام نے موتی چرایا ایک تاجِ مہر کا
بن کے تارا جو افق پر جلوہ پیرا ہو گیا

روحِ رومی چیر کر پردے ہویدا ہو گئی
اک پہاڑی کے عقب سے آشکارا ہو لئی

چہرۂ فرخندہ میں جاہ و جلالِ آفتاب
اس کی پیری میں بھی مانندِ سحر رنگِ شباب

اس کے پیکر میں وہ تابانی وہ نورِ سرمدی
سر سے پا تک ایک تمثالِ سرورِ سرمدی

مضطرب ہونٹوں پہ اس کے سرِّ پنہانِ وجود
جس سے از خود معنی و آواز نے پائی کشود

نطق جیسے آئنہ ہو سامنے آویختہ
علم اور سوزِ دروں کس لطف سے آمیختہ

میں نے پوچھا کیا ہے موجود اور نا موجود کیا؟
معنیٔ محمود کیا ہیں اور ہے نامحمود کیا

آپ نے فرمایا "ہر موجود خواہانِ نمود
انکشافِ خود کا جذبہ ہے تقاضائے وجود

زندگی آراستگی اپنی ہے اپنے آپ سے
تاکہ اس سے اپنی ہستی کی شہادت مل سکے

جب ہوئی اک انجمن روزِ الست آراستہ
یہ شہادت تھی پئے اظہارِ ذاتِ کبریا

زندہ، مردہ یا قریب الموت تو کچھ بھی سہی
تین ہی شاہد ہیں، بُجز ان کے نہیں شاہد کوئی

پہلا شاہد کون ہے؟ اپنا شعورِ ادراکِ ذات
نور سے اپنے ہی پانا اپنی پنہاں کائنات

شاہدِ ثانی شعورِ اوروں کا بھی آئینہ وار
جس کی تابانی سے ہو خود اپنا باطن آشکار

تیسرا شاہد شعورِ ہستیٔ مستورِ حق
تاکہ اپنی ذات کو دیکھیں بہ فیضِ نورِ حق!

گر رہے اس نورِ حق کے سامنے تو استوار
جانِ خود کو حیّ و قائم صورتِ پروردگار

ہے پہنچ جانا مقامِ خویش تک ہی زندگی
دیکھنا بے پردہ پیشِ چشمِ ذاتِ سرمدی

کب ہوئیں وجہ تشفی مردِ مومن کو صفات
مصطفٰے راضی ہوئے کب بُجز بہ دیدِ عین ذات

ایک شاہد کی تمنّا اور ہے معراج کیا
امتحاں ہو رُو برو جس کے خود اپنی ذات کا

شاہدِ عادل کہ ہے تصدیق جس کی لازمی
ورنہ جوں گُل محض رنگ و بو ہے اپنی زندگی

کوئی لا سکتا نہیں اس ذات کی تابِ جمال
تاب لے آئے اگر تو اس کی ہستی بے زوال

تو فقط ذرّہ سہی پھر بھی نہ تاب اپنی گنوا
باندھ لے محکم گرہ میں اپنا جوہر بے بہا

جس قدر افزوں ہو تیری تاب ہے بہتر وہی
دو بدو خورشید کے ہو آزمائش ذات کی

دے نئی ترکیب اپنے پیکرِ فرسودہ کو
امتحانِ ذات کر اور واقعی موجود ہو

در حقیقت ہے یہی موجود جو محمود ہے
ورنہ نارِ زندگی کیا ہے سراسر دود ہے"

میں نے پھر پوچھا کہ "ہُو کیسے رسائی تا خدا
تو نہ کر کوہِ گرانِ آب و گل کا سلسلہ؟

آمر و خالق ہے باہر ممکناتِ دہر سے
اور ہمارا خلق خوں قدر و قضا کے قہر سے"

بولے رومی "ہوں اگر سُلطان سے ہم بختیار
توڑ سکتے ہیں تمام افلاک کے سنگیں حصار

صبر کر تا آنکہ عریاں ہو یہ ساری کائنات
اس کے دامن سے دُھلے گرد و غبارِ شش جہات

بے کمی بیشی نظر آجائے گا تب حق تجھے
خود کا ناظر اس سے، ناظر اس کا اپنے آپ سے

نُکتۂ "اِلّا بسلطان" اپنے دل پہ نقش کر
ورنہ جا کیڑوں مکوڑوں کی طرح کیچڑ میں مر

ہے تولّد ہی سے پیدا یاں ہر اک ذی جاں ہوا
اور اسی سے ہی جہاں میں جلوہ گر انساں ہوا

پھر تولّد ہی سے ہم ہو سکتے ہیں اس سے رہا
توڑ سکتا ہے یہ ساری بندشیں زورِ انا!

یہ ہے روحانی تولد، اس کی نوعیت جدا
پوچھ اہلِ دل سے یہ تازہ ظہورِ جاں ہے کیا

وہ ولادت جبر یہ تھی اور یہ بالاختیار
وہ تھی پردوں میں نہاں، یہ ہوگی قطعاً آشکار

وہ سراپا گریہ تھی اور یہ سراپا خندہ ہے
وہ فقط جوئندہ تھی، یہ سر بسر یابندہ ہے

قرآن (۵۵ : ۳۳) یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا۔

لاتنفذون الا بسلطان (اے گروہ جنوں اور انسانوں کے اگر تم سے ہو سکے کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمینوں کی حدود سے تو نکل جاؤ بغیر اقتدار کے نہیں نکل سکتے۔

وہ سکون و سیرِ محدودِ فضائے کائنات — اور یہ پروازِ اس کی بیرونِ حدودِ شش جہات
وہ بھی محتاجِ شب و روزِ جہاں، بے اختیار — اور یہ پامرد، روز و شب کے توسن پر سوار
طفل آتا ہے شکستِ جسم سے بر روئے کار — اور شکستِ دہر سے مردانِ حق ہوں آشکار
جو ولادت ہو علامت اس کی آوازِ اذاں — ایک تکبیرِ زباں اور دوسری تکبیرِ جاں

ہستیٔ بیدار اگر ہو تاب افزائے بدن
لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے یہ دیرِ کہن"

میں نے پوچھا "یہ ولادت کیا ہے؟ اسکا کچھ بیاں" — بولے "یہ ہے زندگی کی شانوں میں سے ایک شان
زندگی کے دو جدا احوال ہیں، غیب و حضور — ایک سرتاپا ثبات اور دوسرا پیہم مرور
جلوہ گر یہ خود گدازی سے ہے جلوت میں کبھی — اور کبھی خلوت میں اپنی ذات میں ہے منزوی
اس کی جلوت کو منور رکھتا ہے نورِ صفات — اور خلوت اس کی نور آشامِ آب و تابِ ذات
کھینچتی ہے عقل اسے ہنگامۂ جلوت کی سمت — عشق لیکن رہنما ہے گوشۂ خلوت کی سمت
عقل بھی رہتی ہے اس دنیا سے پیکار آزما — یہ طلسمِ آب و گِل ہو جائے تا نذرِ فنا!
جو بھی سنگِ راہ ہے اس کے لئے آموزگار — برق و ابر و باد سب ہوں ہم سخن سیل و بہار
آنکھ گو ذوقِ نگہ سے اس کی بیگانہ نہیں — جرأتِ رندانہ سے اس کو مگر بہرہ نہیں
ڈرتے ڈرتے راہ چلتی ہے یہ اندھوں کی طرح — دھیرے دھیرے ہولے ہولے ننھے چیونٹوں کی طرح
بلکہ چکر کاٹتی ہے رنگ و بو کے گرد و پیش — جادۂ محبوب پر چلنے میں ہے آہستہ کیش

رفتہ رفتہ ہے سرانجام اس کے کاروبار کا
کیا کہیں تکمیل بھی پائے گا اس کا سلسلہ؟

عشق کو کیا واسطہ دورانِ ماہ و سال سے
قرب و دوری تیز تیز اور دھیمی دھیمی چال سے

عقل در آئے پہاڑوں میں بنا کر راستہ
یا پھرے چاروں طرف ان کی بنا کر دائرہ

کوہ یوں ہے عشق کے آگے کہ جیسے پرِ کاہ
دل سریع السیر ہے جس طرح جولانی میں ماہ

عشق بے باکانہ شبخوں بر فرازِ آسماں
تاکہ بے مرگِ طبیعی ہم ہوں آزادِ جہاں

عشق کی تاب و تواں بے خاک و باد و آب ہے
اس کی قوت بے نیازِ طاقتِ اعصاب ہے

نانِ جو سے فتح اس نے قلعۂ خیبر کیا
اک اشارے سے دو ٹکڑے چاند کا پیکر کیا

کلۂ نمرود کو توڑا لڑائی کے بغیر
لشکرِ فرعون کو مارا چڑھائی کے بغیر

عشق جاں میں اسطرح جسطرح آنکھو میں نظر
کارفرما ہے درونِ خانہ ہم بیرونِ در!

عشق خاکستر بھی ہے اور عشق ہی اخگر بھی ہے
کام اس کا دین و دانش سے کہیں بڑھ کر بھی ہے

عشق ہی سلطان ہے اور یہ ہی برہانِ مبیں
دونوں عالم ہیں خدائے عشق کے زیرِ نگیں

لامکاں کیا زیر و بالا کیا، اسی کے تو ہیں سب
سارا دنیا اس کے زیرِ راں ہو وہ اسوار ہو

جب خدا سے ہو طلبگارِ خودی سیار ہو
ہو جہانِ کہنہ کا جذب و کشش نذرِ فنا

آشکارا اس کی بدولت ہو مقامِ دل سوا
عقلِ تاویلی کو اس کی راہ میں قرباں کریں

جو ہیں عاشق خود کو نذرِ حضرتِ یزداں کریں
موت کا اندیشہ اپنے آپ پر کر دے حرام

تو ہے عاشق تو بڑھا دے بے جہت کی سمت گام

اے کہ ہے مُردے کی صورت خفتۂ تابوت تو
آپ اٹھ سکتا ہے تو بے بانگ صور و نائے ہو

تیرے سینے میں ہے صد گونہ نوا فردوسِ گوش
تا بکے کیچڑ میں مینڈک کی طرح محوِ خروش

یہ زماں اور یہ مکاں دونوں ہیں تیرے زیرِ راں
تا بکے زنار کی پیچیدگی میں خستہ جاں ؟

تیز تر آنکھیں ہوں اور حسّاس بیش از بیش گوش
دیکھ اور سُن جو بھی پیش آئے تجھے از راہِ ہوش

وہ جو سن سکتا ہے چیونٹوں کی صدا باریک سی
خود دلِ دوراں سے سن سکتا ہے اسکے راز بھی

وہ نگاہِ پردہ سوز و پردہ در آ مجھ سے لے
جو نہ آنکھوں میں اسیرِ حرکتِ مژگاں رہے

"آدمی کیا ہے سراپا دید باقی پوست ہے
دید کیا ہے ؟ صرف دیدارِ جمالِ دوست ہے
ہو تنِ خاکی گداز ایسا کہ ہو یکسر بصر !
بس رہے باقی نظر، باقی نظر، باقی نظر !

ڈرتا ہے تو آسمانوں سے ؟ نہ ڈر ہرگز نہ ڈر
ڈر نہ پہنائے جہاں سے بھول جا خوف و خطر

دیکھ آنکھیں کھول کر اپنی، زماں ہو یا مکاں
یہ فقط دو حال ہیں منجملۂ احوالِ جاں

جب لقائے جلوہ سے آنکھیں ہٹیں بالاقتضا
اختلافِ دوش و فردا کا جھمیلا پڑ گیا

دانہ مٹی میں اسیرِ ظلمتِ تہہ خانہ ہے
یہ فضائے آسماں کی دید سے بیگانہ ہے

کیا خبر اس کو ہے بالائے زمیں جائے فراخ
جسمیں پھیلا سکتے ہیں ہم خود کو ہر سو شاخ شاخ

اسکا جوہر کیا ہے ؟ نشو و ارتقا، ذوقِ نمو
مقام اس کا ہے، جوہر بھی وہی خود مو بمو

اے کہ تیرا ادعا ہے محملِ جاں ہے بدن
رازِ جاں پر کر نظر، صد حیف یہ پندارِ تن!

جاں کے حالوں میں سے یہ اک حال ہے محمل کجا
اس کو محمل کہنا سر تا سر فریب الفاظ کا!

جان کیا ہے؟ جان ہے جذب و سرور و سوز و شوق
گنبدِ گرداں کو زیر و زیر کرنے کا ذوق

اور بدن کیا ہے؟ فقط وابستگیٔ رنگ و بو
آدمی ہو خوگرِ وضعِ جہانِ چار سو!

اک کرشمہ ہیں شعورِ خام کا نزدیک و دور
اور کیا معراج؟ یہ ہے انقلاب اندر شعور

شوق اور جذبے سے ہوتا ہے بپا یہ انقلاب
زیر و بالا سے رہا ہوتا ہے شوقِ بے حساب

جسمِ انسانی نہیں ہوتا شریکِ کارِ جاں
خاکِ تن ہو روح کی پرواز میں حائل کہاں

زمان و مکان کی روح زروان
مسافر کو عالمِ بالا کی سیر کراتی ہے

یہ کلامِ جاں فزا سن کر ہوا دل بیقرار
میرے تن کا ذرہ ذرہ بن گیا سیماب وار

درمیانِ شرق و غرب آیا دکھائی ناگہاں
اک سحابِ نور جس میں غرق تھا سب آسماں

اس سحابِ نور سے اترا فرشتہ پرفشاں
جس کے دو چہرے تھے اک چہرہ تھا شعلہ اک دھواں

ایک تیرہ تار شب اور دوسرا روشن شہاب
آنکھ بیدار ایک کی اور دوسرے کی مستِ خواب

کیسے رنگا رنگ ڈینے، سُرخ سُرخ اور زرد زرد
نقرئی، نارنجی، نیلے، سبز سبز اور لاجورد!

جیسے البیلا خیال اس کی طبیعت میں وہ رم
از زمیں تا آسماں پرواز اس کی ایک دم!

ہر نفس اس کی ہوا اب اور پھر کچھ اور ہی
پرکشائی کی فضا اب اور پھر کچھ اور ہی !

یوں کہا زرواں نے مُیں ہوں اس جہاں کا قہرماں
گو نگاہوں سے نہاں ہوں پھر بھی ہوں سب پر عیاں

ہے ہر اک تدبیر وابستہ مری تقدیر سے
حلقہ بر پا خامش و گویا مری زنجیر سے

جو بھی غنچہ شاخ سے چٹکا مرے ہی دم سے تھا
جو پرندہ بام پر چہکا مرے سرگم سے تھا

دانہ ہوتا ہے توجہ سے مری اُگ کر نہال
ہر جدائی فیض سے میرے ہی بنتی ہے وصال

میں ہی قہر آگیں عتاب اور میں ہی جاں افزا خطاب
تشنگی پیدا کروں تو بعد میں بخشوں شراب

زندگی میں موت بھی ہیں، میں ہی ہوں حشر و نشور
میں حساب اور میں ہی دوزخ، میں ہی جنت میں ہی حور

کیا بشر اور کیا فرشتے بستہ میرے دام سے
عالمِ شش روزہ نکلا ہے مرے اندام سے!

شاخ سے جو پھول بھی چنتے ہو اس کی جاں ہوں میں
جو بھی شے تم کو نظر آتی ہے اس کی ماں ہوں میں

یہ جہاں میری طلسماتی کمندوں میں اسیر
ہو تا رہتا ہے مرے ہی دم سے ہر ہر لحظہ پیر

لی مع اللہ جن جو انمردوں کے دل میں بس گیا
ان کے دم سے یہ طلسمِ آہنیں برہم ہوا

صدقِ دل سے تو اگر چاہے نہ ہوں میں درمیاں
لی مع اللہ دل سے کہدے صورتِ صاحب دلاں[1]

کیا کہوں اُس کی نگاہِ نازہ میں کیا بات تھی
ہو گیا سارا جہاں مستور آنکھوں سے مری!

آنکھ یا اک اور ہی دنیا پہ میری کھل گئی
یا دگرگوں ہو گیا پل میں جہانِ پیر، سی

کائناتِ رنگ و بو سے مر کے رخصت ہو گیا
اور جنم اک عالمِ بے ہاے و ہو میں لے لیا

ٹوٹ کر پیوند میرا عالمِ پاریہ سے!
اک جہانِ تازہ و نادیدہ ہاتھ آیا مجھے!

اپنی دنیا کی فنا سے اسقدر کاوش ہوئی
اک نئے عالم کی میرے تن سے پیدائش ہوئی

تن سبک تر ہو گیا اور جاں مری سیار تر
چشمِ دل بینندہ تر، گیرندہ تر، بیدار تر

---

[1] حدیث شریف، لی مع اللہ وقتٌ لا یسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ او ملکٌ مقرب (میرا اللہ کے ساتھ ایسا وقت بھی ہوتا ہے جب کسی نبی مرسل یا مقرب فرشتے کو بھی بار حاصل نہیں ہوتا۔)

جو بھی شے مستور تھی وہ آشکارا ہو گئی
پہنچی کانوں میں ستاروں کی نوائے سرمدی

زمزمۂ انجم

عقل تری برِ حیات، عشق ہے سرِّ کائنات
تیرا ورود اے خوشا، چھوڑ کے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری، تیرے لئے ہیں سب رقیب
ایک نگاہ کے لئے، کشمکشِ تجلیات!
جلوے ہیں راہِ دوست میں، تازہ بہ تازہ نو بنو
صاحبِ شوق و آرزو، اور یہ خشک کلیات!
صدق و صفا ہے زندگی، نشو و نما ہے زندگی
زیرِ قدم رہے مدام، ملکِ خدا ہے زندگی[1]
شوقِ غزل سرا کو پھر رخصتِ ہاے دہو تو دے
رند ہو یا کہ محتسب، بھر کے اسے سبو تو دے

---

[1] : تا ابد از ازل بتاز، ملکِ خدا ست زندگی (رومی)

شام و عراق و ہند و پارس، ہو گئے خو گرِ نبات
یہ ہیں فدائے نوش انہیں تلخیٔ آرزو تو دے

بحرِ بلند موج سے تا ہو نبرد آزما
مہر کے دل کو لذتِ لطمۂ تند خو تو دے

مردِ فقیر آگ ہے، میری وقیصری ہیں خس
اتنی سی بات ہے فقط، کرّ و فرِ شہاں کو بس

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری
ایک ہے جذبۂ کلیم، ایک ہے سحرِ سامری

اس کی نگاہ جاں ستاں، اس کی سپاہ خوں فشاں
اک کا طریق آشتی، اک کا طریق عسکری

دونوں جہاں کشا بھی ہیں، دونوں دوام خواہ بھی
وہ بہ دلیلِ قاہری، یہ بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری سے ہو، سدِّ سکندری فنا
رسمِ کلیم تازہ کر، رونقِ سامری مٹا!

فلکِ قمر

فلکِ قمر

یہ زمیں یہ آسماں ملکِ خدا، ملکِ خدا
ہے ہمارا ورثہ انجم کیا مہ و خورشید کیا

دیکھتا جا جو تجھے اس راہ میں آئے نظر
محرمانہ آنکھ سے ہر چیز کا نظارہ کر

یہ جہاں تیرا ہے، اس میں چل نہ بن کر اجنبی
ہاں ذرا بے باک اے گم کردۂ راہِ خودی!

جملہ اشیاء تابعِ فرماں ہیں تیری راہ میں
سب اوامر اور نواہی پر ترے سر خم کریں

کیا ہے یہ آفاق جز دارِ بتانِ چشم و گوش
جس کے ہر فرد اکی قسمت میں فنا مانندِ دوش!

اٹھ طلب کے دشت میں آتش بجاں دیوانہ ہو
یعنی ابراہیم بن غارت گرِ بت خانہ ہو!

جب تو پہنائے زمین و آسماں کو طے کرے
اس جہاں اور اس جہانِ بے کراں کو طے کرے

تو خدا سے اور بھی سات آسماں کر لے طلب
اور بھی صد ہا زماں صد ہا مکاں کر لے طلب

حیف از خود رفتہ ہو جانا لبِ جوئے بہشت
بے نیاز ضرب و حرب و کارزارِ خوب و زشت!

جستجو سے ہو فراغت میں نجاتِ آدمی
تو بہشتِ رنگ و بو سے خوب تر ہے قبر ہی

اے مسافر موت کا پیغام ہے قیدِ مقام
زندہ تر کرتی ہے لیکن جاں کو پروازِ مدام

کیا مزا دیتا ہے یہ تاروں کی سنگت میں سفر
لطف جب ہے یہ سفر رکنے نہ پائے لمحہ بھر

جونہی نادیدہ فضاؤں میں ہوا بال آزما
جو کچھ اونچا تھا وہ اب نیچے نظر آنے لگا

خاکِ تیرہ ہوگئی بالاتر از قندیلِ شب!
میرا ہی سایہ مرے سر پہ عجب ثم العجب!

بڑھتے بڑھتے ہوگئے ہم ہر نفس نزدیک تر
رفتہ رفتہ ہوگیا ظاہر کہستانِ قمر

یہ کہا رومی نے "دل سے دور کر وہم و گماں
خوگرِ رسم و رہِ افلاک ہو اب تیری جاں

چاند ہم سے دور ہے اور پھر بھی کتنا آشنا!
پہلی منزل یہ ہے اپنی راہ میں پاؤں اٹھا

دید کے لائق ہے اس کا دیر و زود، روزگار
دیدنی ہیں اس کے لمبے چوڑے کہساروں کے غار"

ایسا سنّاٹا اور ایسا کوہسارِ ہولناک
دل سراپا سوز اور باہر سے کتنا چاک چاک

سینکڑوں پربت مثالِ خافقین و یلدرم[1]
منہ پہ بل کھاتا دھواں بھرپور شعلوں سے شکم

کوئی سبزہ اس کے سینے سے کہیں اگتا نہ تھا
کوئی طائر اُن فضاؤں میں نہیں تھا پر کشا!

ابر سب بیگانۂ نم اور ہوائیں تند و تیز
تھیں زمینِ مردہ سے دن رات سرگرمِ ستیز

اک جہاں فرسودہ جس میں رنگ ہی پیدا نہ صوت
زندگانی کا نشاں کوئی نہ تھے آثارِ موت!

کوکھ میں اس کے نہ کوئی ریشۂ نخلِ حیات
اور نہ اس کے بطن میں کوئی نشانِ حادثات!

گرچہ ہے چشم و چراغِ دود مانِ آفتاب
اس کے صبح و شام سے پیدا کہاں ہے انقلاب

[1] چاند کے دو آتش فشاں پہاڑ

یوں کہا رومی نے اُٹھ اپنے قدم آگے بڑھا
دولتِ بیدار کو مت کھو کہ یہ ہے بے بہا

اس کا باطن اس کے ظاہر سے کہیں ہے خوب تر
اس کے غاروں میں نہاں ہے ایک دنیائے دگر!

جو نظر آئے تجھے اس راہ میں اے مردِ ہوش!
اس کو رکھ لے اندرونِ حلقہ ہائے چشم و گوش!

آنکھ بینا ہو تو ہر شے دیدنی ہے دیدنی!
ہے ترا زوئے نظر میں ہر گہر سنجیدنی!

جس جگہ لے جاؤں میں چلتے چلو، چلتے چلو
سب سے میرے ماسوا کچھ دیر بیگانہ رہو"

ہاتھ آہستہ سے میرا اپنی جانب کھینچ کر
لے کے جا پہنچے مجھے تیزی سے تا غارِ قمر

ہندی رشی جو چاند کے ایک غار میں آسن جمائے بیٹھا تھا
اور اہلِ ہند اسے وشوامتر (جہاں دوست) کے نام سے
یاد کرتے ہیں

ہاتھ اندھوں کی طرح ساتھی کے شانے پر رکھے
اس اندھیرے گھپ کے اندر میں نے پاؤں رکھ دیے

ایسا اندھیارا کہ جس سے چاند کا دل داغ داغ
بلکہ سورج بھی تھا محتاجِ تب و تابِ چراغ!

وہم و شک نے پے بہ پے مجھ پہ کیے چھپ چھپ کے وار
کر دیے حتّٰی کہ عقل و ہوش دونوں خندہ دار

چل رہا تھا گھات میں رہزن ہی رہزن ہر گھڑی
لذتِ صدق و یقیں دل میں کہیں باقی نہ تھی

رفتہ رفتہ ہو گئے جلوے نظر پہ بے نقاب
ہو گئی اک صبح طالع بے طلوعِ آفتاب!

ہر چٹاں اس لق و دق وادی کی تھی زنّار بند
جمگھٹا دیووں کا انبوہِ درختانِ بلند!

کیا ہے مٹی اور پانی سے اُٹھا اس کا خمیر
یا ہیں وہموں کے ہیولے خواب میں صورت پذیر؟

ہے ہوا میں بادۂ گلرنگ کا ذوق و سرور
سایہ اس کی خاک کو چومے تو ہو دریائے نور!

ہے نہ بالائے زمیں سقفِ سپہرِ لاجورد
اور نہ آنچل پر دھنک کے رنگ پھیلے سرخ و زرد

ظلمتوں کا نور پر سایہ نہ تھا بندِ گراں!
یا دھوئیں کی گردِ صبح و شام تھیں پرچھائیاں

ایک پیپل کے تلے اک عارفِ ہندی نژاد
جس کی آنکھیں سرمہ کی تاثیر سے روشن سواد

سر پہ باندھے وہ جٹا، پوشاک سے عاری بدن
دودھیا سانپ اس پہ پیچاں، دھیان میں اپنے مگن

اک منش، اُتم پرش، سنسار چکر سے بری
دھرتی من مندر میں جیسے مورتی رکھی ہوئی!

کال میں اس کے کوئی گردش کوئی حرکت نہ تھی
نیلگوں آکاش سے اس کو کوئی نسبت نہ تھی!

اس نے رومی سے یہ پوچھا "کون ہے یہ تیرے سنگ؟
جس کے نینوں سے ہے چھلکی پڑتی جیون کی امنگ؟"

رومی

ایک انساں جستجو میں جو مدام آوارہ ہے
ایک ثابت جس کی فطرت رو کشِ سیارہ ہے!

خامیاں ہیں اس کی فطرت میں، وہ ان سے پختہ تر
ہے جمایا اپنا شیشہ آسماں کے طاق پر!
مہر و مہ پر یوں جھپٹتا ہے کہ جیسے شاہباز
ہر سخن اہلِ زمیں سے اس نے رندانہ کہا
شعلے ہی شعلے ہیں پنہاں اس کی موجِ دود میں
والہانہ شوق سے ہر لمحہ سرگرمِ فغاں

میں فدا اس ناتمامی کی متاعِ نازنہ پر!
طالبِ تحسین ہے جبریل سے فکر و نظر
بے دھڑک نو آسمانوں پر ہے اس کی تہ کتازنہ
حور کو اس نے صنم، جنت کو بُت خانہ کہا
ایک شانِ کعبہ یا نی سجدۂ معبود میں
کیا فراق اور کیا وصال، اس کے لئے آنا ہے جاں

اک کرشمہ ہے سراسر اس کا آب و گل ہے کیا
کیا بتاؤں کیا مقام اس کا ہے اور منزل ہے کیا

بھاں دوست

یہ جگت ہے ورن ہی ورن اور سندھ ہر مچاہے
پھر جگت کیا چیز ہے، کیا ہے منش اور کیا ہے ست

رومی

آدمی شمشیرِ حق، شمشیر زن ہے بے اماں!
عالمِ مشرق نے حق نہ دیکھا نہ دیکھا یہ جہاں

تیزیٔ شمشیر کی خاطر جہاں سنگِ فساں!
اور مغرب کھو گیا دنیا میں حق سے بدگماں!

(۱) ورن - رنگ

چشم وا کرنا ہے حق پر در حقیقت زندگی
دیکھنا بے پردہ اپنے آپ کو ہے زندگی!

پالیا اس طرح جس نے رازِ پنہانِ حیات
خود خدا بھی جانتا ہے اس کو شایانِ صلوٰت

اپنی ہی تقدیر سے جس کو شناسائی نہیں
سوزِ جاں کی اس میں کوئی کارفرمائی نہیں

جہاں دوست

پورب اننت اور نا اننت[1] ہی میں الجھا رہا
وہ نہ اِن انمول بھیدوں کی بھنک تک پا سکا

ہم کہ ہیں آکاش باسی کام اپنا دیکھنا
کل کے بارے میں نہیں پورب کے مچھ کو دودھا

کھشمرود اک اونچا پربت پربتوں میں چاند کے
اس کی چوٹی پر کل اترا دیوتا آکاش سے

نین میں اس کے بسی تھی دیکھنے کی کامنا
دیکھتا کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی دھرتی کے بنا

مُت چھپا میں نے کہا، تم ساتھیوں سے من کی بات
نشانت دھرتی میں چھپی ہے ایسی کیا انجانی بات؟

کیا کسی سیتا[2] پہ تیرا من ہوا ہے زکھواں؟
جا کے بابل کے کنوئیں میں کھا گیا ڈبکی ہے پران؟

یہ دیا اُتّر ہُوا پورب کے جگنے کا سمے
اک نئے سورج کی اٹھتی گود سے شبھ جوت ہے

پھوٹنے لاگے ہیں ہیرے پتھروں سے باٹ کے
اور کنوؤں سے بھیوشبھ ہیں باہر آنے لگ گئے

اس کے ہردے میں ہے پھرتی اٹھنے کی ہلچل مچی
پربتوں کی دیہہ[3] میں بھونچال سے ہے کپکپی

(۱) اننت و نا اننت: ہست و نیست (۲) نکھیتر ددیا (فلکیات) میں زہرہ کے نام یہ ہیں: سیتا، شکر، بھرگو، بھارگو، آسیتی (؟) داناد گورو، بھرگوا پترا، آس پھچیت (؟)، (۳) دیہہ: جسم

چھوڑتا جاتا ہے ریتیں اگلی پوجا پاٹ کی! — اس کے من کے دوار ہے کچھ اور ہی آشا بسی

دھن ہیں بھاگ ایسی جاتی کے جو پھر سے جی اٹھے — اپنی مٹی سے ابھاگر اک نیا جیون کرے!

ہے بڑی پرسند رہم پر لوکیوں کو وہ گھڑی
جب کوئی جاتی ہے اپنے آپ آنکھیں کھولتی"

پیر سندی چپ رہا کچھ دیر، پھر میری طرف — رخ کیا اور آشکارا رخ سے تھا مہر و شغف!

"کیا من ہے ترک[1] کا؟" میں نے بتایا "موہ تیاگ" — "کیا ہے مرتیو من کی؟" بولا "ٹوٹ جانا جب سے لاگ"

"دیہہ کیا ہے؟" "ڈھول ہے جو آتما پر جسم گئی" — "آتما کیا؟" "آتما شکتی منش کے دھرم کی"

"ہے منش کیا؟" "میرا اتر گیت بھید اونکار کا" — "اور جگت کیا ہے؟" "جو کچھ ہے دیکھنے میں آرہا!"

"گیان گن کیا؟" "گیان گن ہیں چھال ہی چھال اور کیا" — "کیا انوباد[2] اس کی؟" "میں بولا کہ درشن میت کا!"

"جن گن[3] کا دھرم کیا؟" "کچھ بھی نہیں سن گن بنا" — "کیا بنیوں کا دھرم؟" "شبھ درشن ہے یہ بھگوان کا"

اس رشی کے من کو یہ باتیں کچھ ایسی بھا گئیں
اس نے مجھ سے کتنی ہی کومل، سجل باتیں کہیں

ہندی رشی کی نو گیان گن کی باتیں

۱

یہ دھرتی کی چھایا کیسے ہری کا روپ چھپائے
لہروں کے اودھم سے کبھی تیراک نہ رکنے پائے

(۱) ترک ـ عقل (۲) انوباد ـ دلیل (۳) جن گن ـ عوام ـ

۲

نئے سنسار میں پاؤں دھرنا کتنا من کو بھائے
اس کے کارن نئی ہی شکتی بھگتوں کو ہاتھ آئے

۳

ہے بھگوان پرے مرتیو سے، وہ جیون ہی جیون
کیا ہے منش مرن کا کارن ہم نا جانے کیا بھگون
یہ مانا ہم منش اس جگ کے بے پر پنچھی سارے
پھر بھی گیان میں مرتیو کے پرم آتما سے ہیں آگے!

۴

کال ہے کیا یہ بس ہی بس ہے جس میں ملا امرت بھی
کرپا ہی کرپا پرنتو اس ہیں کرودھ کی وسا ملی!
کید ھراس کا کرودھ نہیں ہے، بن ہو چاہے بستی
بیت گیا اور پاپ کٹا، یہی کرپا اس کی بڑی!

۵

کیا ہے ادھرم؟ یہ آپ ہی مرتیو کا ہے اس سے لڑیں
سور ماؤں کو جچتا نہیں جو مرو ںپیچ وار کریں!

جو ان پیر ہیں دھرم کے اپنے آپ ہی سے رن چاہیں
جیسے چیتے ہرنوں پر وہ اپنے آپ پہ لپکیں

۶

مورتی کے آگے جو ادھرمی کھڑا ہو جگتے تن سے
ایسے دھرمی سے اچھا جو دوار کا بھیر سوئے

۷

اندھے کے نیناں ہی دیکھیں نت جو ٹھیک نہیں
سورج کو دیکھو تو بھلا وہ رات کو دیکھے کہیں

۸

بیج کی ماٹی سے سنگت ہی اس کو پیڑ بنائے
اور منش کا اس ماٹی کی سنگت ناش کرائے
بیج ہے اپنا سارا کس بل ماٹی ہی سے پائے
کس بل پاکر سورج کی کرنوں پہ جال بچھائے

۹

"پھول تو ورن، سگندھ کو کیسے جل ماٹی سے پائے؟"
"سیانے بیانے ہو کر بھی تم کاہے سدھ بسرائے؟"

دیکھ تو بجبری گم سم جس کو نیہا دیکھ نہ پائے
کیسے تیرے لئے ہے آپ ہی آپ سندلیں پہنچائے
اوروں ہی کو کام میں لاکر ہر کوئی جیو بنائے
ہم چپکے ہی چپکے اور تو کھل کے انہیں اپنائے"

جلوۂ سروش

وہ رشی چپ ہو گیا، یوں مہر بر لب ہو گیا
اپنے من میں کھو گیا دنیا سے گویا چل بسا!
فرط ذوق و شوق سے بیگانۂ بزمِ شہود
عالم نیرنگ سے جا پہنچا تا عینِ وجود!
جب حضور اس کا ہوا تب تک ذرہ ذرہ عینِ طور
اور اس بن نور ہے کوئی نہ ہے شانِ ظہور
اس طلسمِ شب میں تھا اک پیکرِ نازہ آفریں
اس شبِ بے اختراں کا اخترِ روشن جبیں!
اس کی زلفوں کی لٹیں سنبل ہی سنبل تا کمر
اس کے چہرے سے فروزاں کوہ و صحرا دشت و در
غرقِ تابانی فروغِ جلوۂ مستانہ سے!
مست بے مے! از مزے جاری لبِ جانانہ سے
ناچتا تھا اس کے آگے ایک فانوسِ خیال
ذو فنوں، پُرکار مانندِ سپہرِ کہنہ سال
دامنِ فانوس پر تھے نقش ہائے رنگ رنگ
شکرے چڑیوں پر جھپٹتے اور آہو پر پلنگ
میں نے رومی سے کہا "یہ کون اے دانائے راز؟
اس رفیقِ کم نظر پر کیجئے افشاء یہ راز"
"پیکرِ رخشندہ یہ مانندِ سیمِ تاب ناک
اولاً ابھرا تھا از اندیشۂ یزدانِ پاک
پھر ہوائے شوق سے وارفتۂ ذوقِ نمود
ہو گیا یہ جلوہ آرائے شبستانِ وجود
ہے ہماری ہی طرح آوارہ و غربت نصیب
تو غریب اور میں غریب اور یہ پری وش بھی غریب

شانِ جبریلی ہے اس کی اور نام اس کا سروش
ہوش سے بیگانہ کر دے پھر بھی دے صہبائے ہوش!

اپنے غنچے کی کشائش بھی اسی شبنم سے ہے
آتشِ مردہ دوبارہ زندہ اس کے دم سے ہے

ارتعاش اس ہی سے ہر شاعر کے تارِ دل میں ہے
ہے اسی سے چاک جو بھی پردۂ محمل میں ہے

میں نے دیکھا ایک عالم اس کے نغموں میں نہاں
اک ذرا سوزِ نفس سے اس کے ہو آتش بجاں"

نوائے سروش

دیکھ نہ کھے رہا ہو تو ناؤ کہیں سراب میں
آیا بھی تو حجاب سے، جائے گا پھر حجاب میں

سرمۂ رازی[1] آنکھوں سے جب کہ تمام دھو لیا
بخت امم کا تب نہاں دیکھ لیا کتاب میں!

گرتی چمن پہ کشت پر، دشت پہ کوہ پر کہیں
خود سے الجھ گئی جو برق جذب ہوئی سراب میں

دیرِ فرنگ میں نہ وہ مردِ لیگانہ پا سکے
جس کا مقام و عزو شاں آ نہ سکے حساب میں

۱- امام فخر الدین رازیؒ مشہور مفسر قرآن۔

کب ہو نصیب قربِ خاص گر نہ ہو شوق خود فزا
باغ کو دل میں جذب کر تو کہ ہے "بو گلاب میں"[1]
مانا خودی کو ہے فنا، تیری نظر ہے نارسا
تہلکہ دیکھے تو تو کیا جو ہے چھپا حباب میں!
نغمۂ دلنواز یہ جنبشِ زخمہ سے نہیں
۳۵۰ ہو رہے ہجرِ خلد میں نالہ کناں رباب میں!

وادیٔ یرغمید کی سیر جسے ملائکہ وادیٔ طواسین کہتے ہیں

رومیٔ آتش بجاں عشق و محبت کا دلیل
تشنہ کاموں کے لئے جس کا سخن ہے سلسبیل
اس نے فرمایا "مغنی جو بھی ہے آتش نفس
اس کے دل میں گر مئے اللہ ھو ہے اور بس
کرتی ہے اس کی نوا گلشنِ خس و خاشاک کو
اپنے آہنگِ رجز سے سرنگوں افلاک کو!
دیتی ہے حق و صداقت کی گواہی یہ نوا!
اور کرتی ہے فقیروں کو شہنشاہی عطا
ہو لہو اس کی بدولت جسم میں سیار تر
اور دل روح الامیں سے زندہ تر بیدار تر
حیف وہ شاعر جو اعجاز ہنر سے فتنہ گر
رہزنِ قلب و جگر ہو اور ابلیسِ نظر
شاعرِ ہندی خدا اس پر کرم اپنا کرے
گر کرے بیگانہ اس کو قوتِ گفتار سے

۱- بو بگلاب اندر

اس نے سکھلائی زبانِ عشق کو خنیاگری
اور خلیلوں کو سکھائے شیوہ ہائے آذری!

جو بھی باتیں ھیں چبائے لقمے ہیں بے سوز و درد
اہل درد اس کو جہاں میں مردہ کہتے ہیں نہ مرد

نغمہ ہائے دلنشیں جن میں نہ ہو شانِ جلال
ان سے بہتر ہیں کہیں خوالوں کے بے معنی مقال ۳۶۰

فطرتِ شاعر سراپا سوز و شورِ جستجو
ذات اس کی خالق و پروردگارِ آرزو!

سینۂ ملت میں شاعر در حقیقت دل ہے دل
ملتیں جن میں نہ ہوں شاعر وہ ہیں انبارِ گل

سوز و مستی اک جہاں کی طرح اندازی کریں
یہ نہ ہو تو شاعری کیوں نوحہ پردازی کریں!

مدعا شعر و سخن کا ہو اگر آدم گری
کیوں نہ کہئے شاعری کو وارث پیغمبری

"اک ذرا پیغمبری پر بھی بیاں فرمائیے
راز اس کا مردِ محرم پر عیاں فرمائیے"

"ملتیں ساری اسی کی تو ہیں آیاتِ کرام
اس کی مخلوقات ہیں ادوارِ انسانی تمام

زمزمہ پیرا اسی کے دم سے ہیں سنگ اور خشت
ہم ہیں سب کھیتی کا حاصل اور وہ مانندِ کشت

پاک کر دیتی ہے اپنے دم سے ریشہ ریشہ کو
اور عطا کرتی پرِ جبریل ہے اندیشہ کو!

ہے مسلسل ہاے وہو وہ اندرونِ کائنات
ہیں سبھی اس کے کرشمے نجم و نور و نازعات[1]

آفتاب اس کا کسی صورت نہیں پاتا زوال
اس کے منکر کو کبھی حاصل نہیں ہوتا کمال ۳۷۰

اس کے آزادوں کی صحبت رحمتِ پروردگار
ضربتِ کرار سے قہرِ الٰہی آشکار!

[1] - نجم و نور و نازعات - قرآن کی سورتوں کے نام

خواہ عقلِ کل بھی ہو تو رہ نہ اس سے برکراں — کیونکہ ہیں اس کی نظر میں عینِ وحدت جسم و جاں

اب براہِ پرِ عمید اپنے قدم کر تیز تر — اور یہ جو کچھ دید کے لائق ہو رکھ اس پہ نظر

دیکھ تو دیوار پہ سنگِ قمر[1] کی جلوہ گری

چار طاسینِ نبوت صورتِ نقشِ حجر[2]

جانتا ہے شوق اپنی راہ خود ہی بے دلیل — ہے سراسر یہ پرِ پروازِ بالِ جبرئیل

شوق کے پاؤں میں راہِ دُور بھی ہے ایک گام — اس مسافر کو تھکا دیتی ہے تعیینِ مقام

ہو گیا میں گام زن مستانہ سوئے پرِ عمید — چلتے چلتے چوٹیاں اس کی ہوئیں مجھ پہ پدید

کیا بتاؤں اس جگہ کا میں شکوہ و احتشام — گرد اس کے سات سیاروں کی گردش صبح و شام

اہلِ دنیا اس کی آب و تاب سے روشن ضمیر — عرشی اس کی خاک کے کحل الجواہر سے بصیر!

حق نے بخشیں مجھ کو آنکھیں، دل دیا گفتار بھی — اور نابِ جستجوئے عالمِ اسرار بھی!

لو اٹھا دیتا ہوں میں اب پردۂ اسرارِ کُل

تا کروں ظاہر تجلائے طواسینِ رسلؐ

---

[1] سنگ قمر - ایک قسم کا سفید پتھر - [2] طواسین - طا (ط) اور سین . سورۂ نمل کے ابتدائی حروفِ مقطعات ہیں ملکر طواسین بنتے ہیں - منصور حلاج کی ایک مشہور تصنیف کا نام کتاب الطواسین ہے جو اقبال کے زیرِ مطالعہ رہی

طاسینِ گوتم

رقاصہ کا تائب ہونا

گوتم

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
پیشِ اربابِ نظر حور و جناں کچھ بھی نہیں
جس کو پائندہ سمجھتے ہیں وہ پائندہ کہاں
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں کچھ بھی نہیں
دانش و حکمتِ مغرب ہو کہ فکرِ مشرق
دونوں بت خانے ہیں اور طوف بتاں کچھ بھی نہیں!
خود کو دیکھ اور نہ اس بن سے گزر ڈرتا ہوا
کہ تو ہی تو ہے وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

میں نے نوکِ مژہ سے کھودی ہے جو راہ دہاں
منزل و قافلہ و ریگِ رواں کچھ بھی نہیں!

در گزر رغیب سے یہ وہم و گماں کچھ بھی نہیں
دہر میں رہتے ہوئے ترکِ جہاں کیا کچھ ہے!
ایسی جنت جو خدا بخش دے تجھ کو بے کار
صلۂ حسنِ عمل ہو تو جناں کیا کچھ ہے!
راحتِ جاں کی طلب؟ راحتِ جاں کچھ بھی نہیں
یہ غمِ ہم نفساں، اشکِ رواں کیا کچھ ہے!
چشمِ مخمور، نگاہ غلط انداز، سرود
خوب ہیں، ان سے سوا جنسِ گراں کیا کچھ ہے!
حسنِ رخسار ابھی ہے تو ابھی کچھ بھی نہیں
حسنِ کردار و خیالاتِ جواں کیا کچھ ہے!

رقاصہ

فرصتِ کشمکش نہ دے اس دلِ بیقرار کو
پیچ دے اک دو اور بھی گیسوئے تابدار کو

تجھ سے ہیں میری روح میں اتنی تجلیاں بھری
ڈالا ہے مہر و ماہ پر تلخیٔ انتظار کو!

ذوقِ حضور ہی ہوا دہر میں وجہ بت گری
عشق نے کیا دیا فریب جان امیدوار کو!

تاکہ فراغِ طبع سے نغمۂ تازہ سر کروں
پھر وہی مرغزار دے طائرِ مرغزار کو

طبع بلند دی تو سب بند بھی کھول دے کہ میں
بدلوں ترے گلیم سے خلعتِ شہریار کو!

تیشہ چلایا سنگ پہ کونسا یہ کمال ہے،
عشق اٹھا کے لے چلے دوش پہ کوہسار کو!

طاسینِ زرتشت

اہرمن کے ہاتھوں زرتشت کی آزمائش

اہرمن

میری مخلوقات نالاں تجھ سے ہے مانندِ نے
ہیں بہاروں کی بہاریں بھی ہمارے حق میں قے

سب جہاں میں کر دیا تو نے مجھے نخوار و زبوں
نقش میں اپنے بھرا ہے رنگ، لے کر میرا خوں!

جلوۂ سینا نے تیرے حق کو زندہ کر دیا
۴۰۰
میرے حق میں موت کا باعث یدِ بیضا ترا

تکیہ میثاقِ الٰہی پر ہے کارِ ابلہی
حسبِ منشائے مشیت کام کرنا گمرہی

زہر ہی زہر اس کی موجِ بادۂ گل فام ہے
آرہ، کیڑے اور سولی، صدق کا انعام ہے

جز دعاؤں کے تھی آخر نوحؑ کی تدبیر کیا
بے اثر ثابت ہوئی بیچارے کی ہر التجا

چھوڑ دے شہروں کو اب جا بیٹھ غاروں میں کہیں
اور نورانی فرشتوں ہی کا ہو صحبت گزیں!

کیمیا کر دے نگاہوں کے فسوں سے خاک کو
یا دعاؤں سے بھسم کر دے تمام افلاک کو

کوہساروں میں بہ اندازِ کلیم آوارہ ہو
نیم سوزِ التہابِ آتشِ نظارہ ہو!

لیکن اچھا ہے کہ تو پیغمبری کو چھوڑ دے
اس طرح کے شیوۂ ملاگری کو چھوڑ دے

ناکسوں میں کس بھی آجائے تو وہ ناکس بنے
ہو سراپا شعلۂ فطرت بھی تو خار و خس بنے

جب نبوت کا ولایت سے ہے کم تر مرتبہ
عشق کو پیغمبری جز دردِ سر ہے اور کیا

اٹھ اور اٹھ کر جا کہیں کاشانۂ وحدت میں بیٹھ
چھوڑ دے جلوت کا غوغا گوشۂ خلوت میں بیٹھ

۴۱

زرتشت

نورِ بحرِ بیکراں ہے جس کا ساحل تیرگی
سیل مجھ سے تند تر کب اس کے سینے سے اٹھی

میرے پہلو میں نہاں ہیں موج ہائے بیقرار
کیا ہے آخر سیل کا جز غارتِ ساحل شعار

نقش وہ بے رنگ، دیکھا ہو نہ آنکھوں نے جسے
کون کھینچے جز بخونِ اہرمن، کیسے کھنچے!

زندگی کیا ہے خودی کو اپنی کرنا آشکار
آنہ مانا زورِ بازو کا ہے ہستی کا عیار

موجِ طوفانِ بلا ہی سے خودی ہو پختہ تر
اور اس حد تک کہ ہو ذاتِ خدا کی پردہ در!

شیوۂ حق بیں، نہ دیکھے خود کو وہ حق کے سوا
لاالہ کہنا، تڑپنا، موجِ خوں میں لوٹنا

آبروئے عشق اسی میں ہے کہ وہ تڑپا کرے
آرہ و دار و رسن عیدیں ہیں اس کے لئے

راہ حق میں جو بھی پیش آئے ہے سب برجا روا
دوست کی نامہربانی کی ادائیں مرحبا

جلوۂ حق کا نہ اپنے ہی لئے خواہاں ہوا
حسن کے بے انجمن دیدار میں ہے کیا مزا!

کیا ہے خلوت؟ درد و سوز و اضطراب و آرزو
انجمن دیدار ہے، خلوت ہے ذوقِ جستجو! ۲۰

عشق خلوت میں کلیم اللہ کا اعجاز ہے
اور ہو جلوت میں تو سلطانی علم افراز ہے

خلوت و جلوت ہیں دونوں ہی کمال سوز و ساز
دونوں کے دونوں ہیں حالات و مقاماتِ نیاز

کیا ہے وہ؟ آگے گذر جانا کنشت و دیر سے!
اور یہ جانا نہ تنہا خواہ جنت بھی ملے

خلوت و جلوت، ہے گو دونوں میں ہی شان خدا
نقطۂ آغاز خلوت اور جلوت انتہا!

کیا کہا تو نے بلائے جان ہے پیغمبری؟
ہاں مگر جب عشق ہو کامل تو ہے آدم گری

راہِ حق میں کارواں کے ساتھ چلنا خوب تر
یعنی ہو دارِ جہاں میں مثل جاں اپنا گذر!

طاسینِ مسیح

حکیم طالستائیؔ کا خواب

درمیانِ کوہسارِ سنگلاخِ ہفت مرگ
سونی سونی وادیٔ بے طائر و بے شاخ و برگ!

چاندنی بھی دھول کے بوجھل دھوئیں سے عینِ قیر
آفتاب اس کی غبار آگیں فضا میں تشنہ میر!

ایک دریا پارے کا سنسان وادی میں رواں
خم پہ خم کھاتا ہوا مانندِ جوئے کہکشاں!

مست دریا جس کے آگے سب بلند و پست ہیچ
تند خو و تند سیر و موج موج و پیچ پیچ! ۴۳۰

غرق اس پارے کے دریا میں اک انساں تا کمر
اس کے ہونٹوں پہ ہزاروں نالہ ہائے بے اثر!

اس کی قسمت میں نہ دخلِ ابر و باد و آب کچھ
تشنہ لب لیکن میسّر تھا نہ جز سیماب کچھ

بہ لبِ دریا کھڑی اک مہ جبیں نازک بدن
جس کی چشمِ پر فسوں سو کارواں کی راہزن

سامری وش کافری آموزِ پیرانِ کنشت
اس کے افسونِ نگہ سے زشت خوب اور خوب زشت

لے - طالستائیؔ - روس کا نامور فلسفی

میں نے پوچھا "اے فسوں پیشہ ہے تیرا نام کیا؟ — کیوں سراپا نالہ و فریاد ہے صبح و مسا؟"
"نام افرنگیں مرا اور کام میرا ساحری! — میری آنکھوں میں ہے پوشیدہ طلسمِ سامری"
دفعتہً وہ جوئے سیمیں ایسی یخ بستہ ہوئی — اس جواں کی ہڈی ہڈی پارہ پارہ ہو گئی!
چیخ اٹھا "اے دریغا اے مری تدبیر ہائے!" — وائے برمن! یہ مری فریادِ بے تاثیر ہائے!"
وہ ہوئی گویا "بجا ہے تیرا یہ شیون مگر — ڈال اپنے نامۂ اعمال پر بھی اک نظر!
ابنِ مریم وہ کہ تھا چشم و چراغِ کائنات — نورِ جس کا رونقِ افزائے جہاتِ دبے جہات!
وہ فلاطوس اور وہ دار اور چہرا ترا زرد سا — کیا کیا تو نے جہاں میں اور اس نے کیا کیا!
اے کہ تیری جان پر ہے لذتِ ایماں حرام — اے کہ تو یکسر پرستارِ بتانِ سیمِ خام
قیمتِ روح القدس تو نے نہ پہچانی ذرا
تن ہی تن تو نے خریدا نقدِ جاں کو تج دیا!"

اس سراپا جلوہ کے لب سے یہ طعنہ کرب زا — ایک نشتر کہ تھا پیوستِ رگِ جاں ہو گیا
وہ پکارا اٹھا کہ "اے گندم نمائے جو فروش — تیرے دم سے برہمن اور شیخ سب ملت فروش
تیری کفر آئینیوں سے عقل و دیں ہیں پست و خوار — تیری سودے بازیوں سے عشق کی مٹی بھی خوار
دوستی آزار تیری، ایک آزارِ نہاں — دشمنی تیری ہے مرگِ اور وہ بھی مرگِ ناگہاں
آب و گل سے عہد و پیمانِ وفا تو نے کیا! — بندہ کو ذاتِ الٰہی سے جدا تو نے کیا!
دانش و حکمت کہ جن سے عقدۂ اشیاء ہو وا — اُن سے غیر از فکرِ چنگیزی ملا تو کیا ملا

جانتا ہے اس حقیقت کو جو ہو صاحب نظر
جرم سے میرے ہے تیرا جرم سنگیں کس قدر ۴۵۰

اس کے دم سے جانِ رفتہ تن میں آتی لوٹ کے
اور تجھ سے جسم بہرِ جان قبرستاں بنے!

ہم نے جو کچھ بھی عمل ناسوت سے اس کے کیا
اس کی ملّت نے وُہی لاہوت سے اس کے کیا

موت میں تیری نہاں اہلِ جہاں کی زندگی
دیکھ تو ہوتا ہے کیا تیرا مآلِ کار بھی!

طاسینِ محمدؐ

خانۂ کعبہ میں روحِ ابوجہل کا نوحہ

سینہ سینہ ہے محمدؐ سے ہمارا داغ داغ
گل ہوا موجِ نفس سے اس کی کعبے کا چراغ!

یوں فنائے قیصر و کسریٰ کی سر کی داستاں
لے گیا بہکا کے وہ سارے کے سارے نوجواں!

ایک ساحر نطق میں پوشیدہ جس کے ساحری
یہ دو حرفِ لا الٰہ بھی کیا ہیں؟ عینِ کافری

جب سے الٹی دینِ آبا کی بساط اے وائے ما!
دیوتاؤں سے ہمارے جو نہ کرنا تھا کیا!

پارہ پارہ اس کی ضربِ تیشہ سے لات و منات
اُس سے اس توہین کا لے انتقام اے کائنات!

دل کو غائب پر فدا، حاضر سے بیگانہ کیا
نقشِ حاضر کو فسوں سے اپنے صد پارہ کیا

آنکھ کی وابستگی غائب سے ہے عینِ خطا
جو نگاہوں کو دکھائی ہی نہ دے وہ چیز کیا؟

سجدہ غائب کو روا رکھنا بجز کوری ہے کیا
دینِ نو ہے کور اور کوری کا فرقت مقتضا

سرنگونی بندہ دش پیشِ خدائے بے جہات!
آدمی کو لطف کیا بخشے بھلا ایسی صلوٰت!

وائے بر دینِ محمدؐ قاطعِ ملک و نسب — خود قریش خالص اور انکارِ تفضیلِ عرب!
اس کی نظروں میں برابر پست اور بالا[1] تمام — کھائیں دسترخوان پر اک ساتھ آقاؐ و غلام!
قدرِ اشرافِ عرب اس نے نہ پہچانی ذرا — بھدّے بدگل حبشیوں سے رسم و رہ یوں برملا
کیا غضب ہے اسود و احمر کی آمیزش ہوئی — خاندانی عزت و ناموس غارت ہو گئی!
یہ اخوت، یہ مساوات اعجمی ہے اعجمی — جانتا ہوں خوب سلماں[2] مزدکی[3] ہے مزدکی
ابنِ عبداللہ نے کھایا ہے دھوکہ کس قدر — ہو گیا سارے عرب میں جس سے برپا شور و شر
نسلِ ہاشم ہو گئی اپنوں ہی سے مجبور حیف! — دیدۂ بینا دو رکعت سے ہوئے بے نور حیف!
عجمیوں کو ہے میسر فضلِ عدنانی[4] کہاں — گونگے النسانوں میں وہ اعجازِ سحبانی[5] کہاں ۷۰۴
چشمِ خاصانِ عرب یوں ہو گئی نا راست بیں — کیوں زہیر[6] اب قبر سے باہر نکل آتا نہیں!

اے کہ اس صحرا میں پائیں تجھ سے رہ ابن السبیل
توڑ دے اگر طلسماتِ نوائے جبرئیل!

ہاں بتا اے سنگِ اسود ہاں بتا دے برملا — جو بھی گذرا ہے محمدؐ کی بدولت ماجرا
اے ہبل ہم پہ کرم، اپنی دعا ہو مستجاب — دشمنانِ دین سے ہو اپنے حرم کا بازیاب
ان کی بھیڑوں کی قطاریں بھیڑیوں کی نذر کر — تلخ کر دے ان کے نخلوں پہ کھجوروں کے ثمر!

---

[1] در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست (رومی)، [2] سلمان فارسی مشہور صحابی

[3] مزدک - ایران قدیم کا (ساسانی دور میں)، بانیٔ اشتراکیت - [4] عدنانی - عربوں کا مورثِ اعلیٰ!

دے ہوائے بادیہ کو اک سمومِ جاں گزا
تیرے صدقے اَللّٰھُمَّ اعجازُ نخلٍ خاویہ

اے منات! اے لات! اس محبوب منزل سے نہ جاؤ
اور اگر جاتے بھی ہو تو خانۂ دل سے نہ جاؤ

اے کہ تیرا اپنی آنکھوں سے ہے پیمانِ وفاق
اک ذرا مہلت، اگر ہم سے ہے خواہانِ فراق

---

۵ - سحبان بن وائل - جو اپنی فصیح البیانی کے لئے مشہور تھا۔ ۶ - زہیر - عرب کا مشہور شاعر - ۷ - قرآن (۶۹ - ۷) "اور وہ عاد تھے جو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ ہاتھوں سے نکلی جائے۔ اس ہوا کو ان پہ مقرر رکھا لگاتار سات راتوں اور آٹھ دنوں تک۔ اور پھر تو دیکھے کہ لوگ اس میں پچھڑ گئے۔ گویا کھوکھلے تنے ہیں کھجور کے درختوں کے جو زمین پر گر پڑے ہوں"۔ ۸ "اَن کنتِ ازمعت الفراق۔ اے محبوب اگر تو نے جدا ہونے کا تہیہ ہی کر لیا ہے تو پھر مجھے تھوڑی دیر مہلت دے"۔ یہ امراء القیس کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے۔

فلکِ عُطارد

جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا

کی

ارواح کی زیارت

مرتبہ کتنا بڑھا یا میری مشتِ خاک نے
جبکہ نیرنگِ تماشا اپنے ہی جلوے بنے

یا تو میں خود تھا اسیرِ صید گاہِ ہست و بود
یا ہوئی نخچیر میرے دام کی بزمِ وجود! ۴۸۰

چاک میرے ہاتھ سے ہے کیا یہ پردہ نیلگوں؟
مجھ پہ ہیں افلاک غالب یا ہیں غالب ان پہ ہوں؟

گنبد افلاک سے محصور ہے میرا ضمیر؟
یا تمام افلاک ہیں خود اس کے حلقے میں اسیر؟

مجھ سے بیروں یا دروں کیا چیز ہیں یہ این و آں؟
کیا ہے اور کیسا ہے جو بھی ہے نظر آئے یہاں؟

پر کشا اک اور ہی آفاق میں ہو جاؤں میں
نت نئے نادیدہ نظاروں کی دنیا پاؤں میں

کہ جہانِ بیکرانِ کوہ و دشت و بحر و بر
عالمِ خاکی سے بھی دیرینہ تر پارینہ تر!

بس ننھے ابر کے ٹکڑے سے ابھرا جو جہاں
دستِ بُردِ آدمی سے بے خبر پاکیزہ جہاں

نقش رنگا رنگ اس کی لوحِ ہستی پر کجا
نکتہ چینِ فطرت و قدرت یہاں کوئی نہ تھا

میں نے رومی سے کہا صحرا یہ ہے کیا دلربا
شورشِ دریا ہے کہساروں میں کیسی جانفزا!

زندگی کا کوئی بھی پیدا نہیں نام و نشاں
کس جگہ سے آ رہی ہے پھر یہ آوازِ اذاں؟

یوں کہا رومی نے "یہ جا ہے مقامِ اولیا!
جو ہمارے خاکداں سے ہے کبھی کا آشنا!

حضرتِ آدم ہوئے فردوس سے جس دم رواں
ایک دو دن کے لئے مہمان ٹھہرے تھے یہاں

گونجی تھی اس کی فضا میں ان کی آہِ سوزناک
نالہ ہائے صبح سے ساری فضا تھی چاک چاک

اسقدر ہے یہ مقامِ کبریائی ارجمند
اس کے زائر پاک مردانِ مقاماتِ بلند

زائرانِ پاک مانندِ فضیل و بوسعید
کاملانِ مشربِ عرفاں جنید و بایزید

آؤ تا بروقت جا پہنچیں وہاں بہرِ نماز
ایک دو دم ہو میسّر لذتِ سوز و گداز"

میں نے دیکھا آگے بڑھ کر دو بشر کا تھا قیام
مقتدی تاتار، آئے ایک افغانی امام

مرشدِ رومی ہمیشہ آرزو مندِ حضور
اس کا چہرہ تمتما اٹھا بہ ذوق و سرور!

ان سے بہتر لوگ کب دنیائے مشرق سے اٹھے
کاوشِ ناخن سے جن کی اپنے عقدے حل ہوئے

برگزیدہ سید السادات مولانا جمال
زندہ جس کے معجزِ گفتار سے سنگ و سفال

ترک سالارِ گرامی وہ حلیمِ دردمند
ذات والا کی طرح افکار بھی جس کے بلند

عینِ طاعت اس کی ہمراہی میں دو ہی رکعتیں
ورنہ وہ طاعت ملیں جس کے عوض میں جنتیں

وہ بزرگِ سخت کوش اور اس کی قرأت دلستاں — سورۂ والنجم اور خاموش دشتِ بیکراں!
ایسی قرأت جس سے مستِ کیف ہو جانِ خلیل — وجد میں آجائے جس سے روحِ پاکِ جبرئیل!
خود بخود سن کر اسے سینے میں دل ہونا صبور — شورِ "لا الٰہ الا اللہ" سے گونج اٹھیں قبور!
اضطراب شعلہ بخشے موجہ ہائے دود کو! — اک جہانِ سوز و مستی حضرتِ داؤد کو!

اس کی قرأت کے فسوں سے آشکارا ہر غیاب
نقطہ نقطہ، پارہ پارہ، بے حجاب ام الکتاب

میں اٹھا اپنی جگہ سے دم بخود بعد از نماز — ہاتھ چومے والہانہ اس کے از راہِ نیاز
بولے رومی اس سے "یہ ہے ذرۂ گردوں نورد — اس کے سینے میں نہاں ہے اک جہانِ سوز و درد!
غیر خود اس نے کسی پر آنکھ وا کی ہی نہیں — اس قدر آزاد، جاں نذرِ وفا کی ہی نہیں

لسکہ وہ تیزی سے ہے سیار پہنائے وجود
از رہِ شوخی کہا کرتا ہوں اس کو زندہ رود"

افغانی

زندہ رود آ، اپنے دیرینہ جہاں کی کچھ سنا — گوش شنوا کو زمین و آسماں کی کچھ سنا

تو ہے خاکی اور مثالِ قدسیاں روشن بصر
کچھ مسلمانوں کے دے احوال کی ہم کو خبر

زندہ رود

وہ ضمیرِ ملّتِ عالی ھِمم گیتی شکن
اس کے اندر ہے بپا آویزشِ دین و وطن!

روح تن میں مر چکی، اس در بجہ ہے ضعفِ یقیں
ہے سراسر ناامید از قوتِ دینِ مبیں

ترک و ایران و عرب ہیں سب کے سب مستِ فرنگ
ہے گلوگیر ان تمام اقوام کا دستِ فرنگ!

غلبۂ سلطانیٔ مغرب سے ہے مشرق خراب
اشتراکیت نے چھینی مذہب و ملت کی تاب!

افغانی

دین و وطن

مغربی اربابِ جاہ و مال عیارِ زمن
ہے انہی نے اہلِ مذہب کو دیا درسِ وطن

فکرِ مرکز اُن کو دامنگیر، تو پُر از نفاق
چھوڑ بھی یہ قصۂ شام و فلسطین و عراق

ہو اگر تیری نگاہوں میں تمیزِ خوب و زشت
ہو نہ تیرا دل دل پرستارِ کلوخ و سنگ و خشت

دیں ہے دامن جھاڑ کر اٹھ جانا گرد و خاک سے
رفع ہو جانا کثافت کا ہے جانِ پاک سے

گر پکارا تجھے تہہ دل سے کوئی "اللہ ھو"
پھر کہاں وہ پائے بندِ کائناتِ چار سو!

ایک تنکا ہو پرافشاں خاک سے بالائے خاک
حیف اگر پیوندِ خاکِ پست ہو یہ جانِ پاک

گرچہ آب و گل سے ہی انسان لیتا ہے جنم
مثلِ گل کرتا انہیں سے ہے وہ کسبِ رنگ و نم

حیف ہے گر آب و گل میں وہ سدا لپٹا رہے
حلقہ ہائے دام سے اُڑ کر نہ باہر جا سکے

جسم کی تعلیم "ہو جا دفنِ خاکِ رہگذر"
جان کا ارشاد "اُٹھ اور ڈال عالم پر نظر"

شش جہت میں جاں سما سکتی نہیں اے ہوشمند
ہیں مگر مردانِ حُر بیگانۂ ہر قید و بند!

حُر ہو خاکِ تیرہ سے دہشت زدۂ اندوہ مند
شاہبازوں کو بھلا چوہوں کی بل ہو کیا پسند

خاک کے تو دے جنہیں کہتا ہے تو اپنا وطن
جن کو دیتا ہے قرار ایران اور مصر و یمن!

ان سے ہے اہلِ وطن کا ایک گونہ رابطہ
کیونکہ ان کی خاک سے ہوتی ہے ملت رونما

تو اگر اس رابطِ باہم پہ کرے غائر نظر
ہاتھ آئے ایک نکتہ بال سے باریک تر

گرچہ مشرق ہی سے ہوتا ہے ظہورِ آفتاب
باتجلی ہائے شوخ و تند و تیز و بے حجاب

مضطرب رکھتا ہے لیکن اس کو اک سوزِ دروں
تا کہ قیدِ مشرق و مغرب سے نکلے لالہ گوں!

سینۂ مشرق سے کرتا ہے ظہورِ جلوہ مست
تا کہ کل آفاق پر ہو تاب و تب سے چیرہ دست!

اس کی فطرت مشرق و مغرب کی بندش سے بری
گرچہ ہے از روئے نسبت اس کی ہستی خاوری!

اشتراکیت اور ملوکیت

صاحبِ سرمایہ[۱] وہ زائیدۂ نسلِ خلیل
ایک پیغمبر کہ ہے پیغمبرِ بے جبرئیل!

بسکہ باطل میں ہے اس کے حق کا عنصر بھی نہاں
العجب قلب اس کا مومن اور دماغ کافراں[۲]

اہلِ مغرب نے کیا گُم وسعتِ افلاک کو
وہ شکم میں ڈھونڈتے ہیں کارِ جانِ پاک کو!

کسبِ رنگ و بو نہیں کرتی بدن سے جانِ پاک
کام کوئی بجز بدن رکھتا نہیں ہے اشتراک

دین جو رکھتا ہے یہ پیغمبرِ حق ناشناس
ہے مساواتِ شکم پر ہی تمام اس کی اساس

ہے اخوت کا مقام الحق درونِ جان و دل
اس کی جڑ ہے جان و دل میں ماورائے آب و گل

ہے ملوکیت بھی ایسے ہی بدن کی فربہی
سینۂ بے نور اس کا ایک قلم دل سے تہی!

شہد کی مکھی ہے یہ کر کر کے جو پھولوں کو مس
پتیوں کو چھوڑ کر ہونٹوں میں لے اُڑتی ہے رس

ہے دلیکن شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل وہی
حسنِ جانانہ پہ اس کے نالۂ بلبل وہی

۱۔ "صاحبِ سرمایہ"۔ اقتصادیات پر شہرۂ آفاق تصنیف "داس کیپیٹل" کا مصنف کارل مارکس جس نے اس کتاب میں اشتراکیت کے اصول بیان کئے ہیں۔ ۲۔ ایک شخص کے متعلق محمدؐ کا ارشاد۔

اس طلسم، اس رنگ و بوئے ظاہری سے درگذر — حسنِ صورت پر نہ جا، کر حسنِ معنی پر نظر

مرگِ باطن گو نظر مشکل سے آتی ہے مگر
گُل نہ کہہ اس گِل کو تو ہر چند گُل آئے نظر

مزاج دونوں کی نہایت ناصبور و ناشکیب — بے خبر یاری سے دونوں، سر بسر آدم فریب
اس کو سودائے خراج اور وہ ہے جویائے خراج — دونوں پتھر، آدم ان کے درمیاں نازک زجاج
علم و دین و فن کے ہتھیاروں سے یہ غارت کناں — وہ اڑائے تن سے جاں اور ساتھ ہی ماتھوں سے ناں
میں نے ان دونوں ہی کو دیکھا غریقِ آب و گِل — جسم دونوں کے فروزاں، تیرہ و تاریک دل!

زندگی ہے سوختن اور ساختن کا امتزاج
تخمِ دل کو خاک میں بو دینا ہے اس کا مزاج

سعید حلیم پاشا

شرق و غرب

اہلِ مغرب کے لئے ہے زیر کی سازِ حیات
زیر کی ہے عشق کے سوزِ دروں سے حق شناس
عشق کو جب ہو میسّر زیر کی کی ھمدمی
اٹھ اور اٹھ کر اک جہانِ تازہ کی تعمیر کر
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ہے افسردہ ہے
زخم کھائے ہیں انہوں نے اپنی ہی شمشیر سے
سوز و مستی ڈھونڈنا اس خوشۂ انگور سے

اہلِ مشرق کے لئے ہے عشق رازِ کائنات
زیر کی سے کاروبارِ عشق کی محکم اساس!
اک نیا عالم ہو پیدا، بات ہو کچھ اور ہی!
ربطِ عقل و عشق سے تیار کر نقشِ دگر
ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں جسم میں دل مردہ ہے!
اپنے ہی نخچیر کے مانند بسمل ہو گئے!
عصرِ دیگر کی تلاش اس چرخِ بے مقدور سے!

آگ میں تیری نہاں ہے زندگی کا سوز و ساز
آفرینش عالمِ نو کی ہے تیری وجہِ ناز!

مصطفیٰ[1] ذوقِ تجدد سے جو تھا نغمہ سرا
کہتا تھا ہر نقشِ کہنہ کو فنا کر دو فنا

کیسے مل سکتا ہے کعبے کو نیا رختِ حیات
گر اسے ملتے رہیں افرنگ سے لات و منات؟

کوئی ترکوں میں نہیں آہنگِ نو کا زیر و بم
کہنہ افرنگ، اُن کی ہر نوا ہے خستہ دم

ان کے سینے میں کوئی نوخیز تازہ دم نہ تھا
قلب کی گہرائی میں کوئی نیا عالم نہ تھا

عالمِ موجود کی تسلیم پر مجبور تھے
موم کی مانند پگھلے اس جہاں کے سوز سے

شیوۂ تقلید اور سامانِ تقویمِ حیات!
اس سے جدت کار فرمائے نہادِ کائنات!

زندہ دل انساں جو ہو، خلّاقِ اعصار و دہور
شیوۂ تقلید سے ہو اس کی فطرت بے حضور

گر مسلمانوں کی صورت تو بھی رکھتا ہے جگر
دیکھ اپنے دل میں اور قرآں پہ رکھ اپنی نظر

سو جہانِ تازہ اس کی سرمدی آیات میں
عصر پہ ہیں عصر پیچیدہ تمام آنات میں

اک جہاں ان میں سے کافی عصرِ حاضر کیلئے
ہاتھ آجائے اگر نورِ بصیرت سے تجھے

مردِ مومن آیتِ شانِ خدائے پاک ہے
ہر جہاں اس کو موافق صورتِ پوشاک ہے

پیرہن کی طرح فرسودہ ہو اک دنیا اگر
بخشش دیتا ہے اسے قرآن دنیائے دگر

۱- مصطفیٰ کمال اتاترک

زندہ رود

کشتیٔ اہلِ زمیں کا ناخدا کوئی نہیں
کون جانے عالمِ قرآں کہاں ہے جا گزیں

افغانی

ایک عالم جو ہمارے سینے میں ہے گم ہنوز
عالمِ پنہاں جسے ہے انتظارِ قم ہنوز

ایک عالم ناشناسِ امتیازِ خون و رنگ
شامِ تابانی میں جس کی غیرتِ صبحِ فرنگ!

ایک عالم جس میں ناپید اسلاطین و عبید
قلبِ مومن کی طرح جس کا کنارہ ناپدید!

ایک عالم جانفزا، فیضِ اک نگاہِ خاص کا
جس نے تخم اس کا دل و جانِ عمر میں بو دیا!

لازمان و جاوداں یا واردانِ نو بنو!
مایہ دارِ برگ و بارِ ممکناتِ نو بنو!

اس کے باطن کو تغیر کا نہیں کوئی بھی غم
گرچہ ظاہر میں ہو برپا انقلابِ دمبدم

تیرے سینے میں ہے پنہاں دیکھ یہ نادر جہاں
آ بتاؤں اس کے میں ارکانِ محکم کے نشاں

عالمِ قرآنی کے محکمات

خلافتِ آدمؑ

دونوں عالم میں نمایاں جا بجا آثارِ عشق
ہستیٔ آدم بھی ہے منجملۂ اسرارِ عشق!

سرِّ آدم عالمِ ارحام میں مضمر نہیں
یعنی سام و حام و روم و شام میں مضمر نہیں

کوکبِ نوری کہ ہے بے شرق و غرب اور بے غروب
حلقۂ گردش میں اس کے کب شمال اور کب جنوب

حرف انی جاعلٌ فی الارض تقدیر اسکی ہے
از زمیں تا آسماں ہر گاہ تفسیر اس کی ہے

مرگ و قبر اور حشر و نشر اس کے سبھی احوال ہیں
نور و نارِ آخرت بھی ثمرۂ اعمال ہیں

وہ امام اور وہ صلوٰۃ اور وہ حرم سب کچھ وہی
وہ سیاہی، وہ کتاب اور وہ قلم سب کچھ وہی

تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا غیب ہو معروفِ عام
کوئی بھی منزل نہیں اس کی نہ ہے کوئی مقام

اس کی ہستی ہے بنائے اعتبارِ ممکنات
اور طرزِ اعتدال اس کا عیارِ ممکنات

۱- قرآن (۲-۳۰) انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ (میں بنانے والا ہوں زمین پر ایک خلیفہ)

کیا بتاؤں میں کہ اس کا بحر بے ساحل ہے کیا
غرقِ سب عصر اور زمانے اسمیں، ظرفِ دل ہے کیا

آدمی میں جو سما جائے اسے عالم کہیں
جو نہ عالم میں سما پائے اسے آدم کہیں!

اس کی جلوت سے تجلی مہر و مہ کی آشکار
اس کی خلوت میں نہیں جبریل کو بھی اذنِ بار!

آسمانوں سے بھی برتر ہے مقامِ آدمی!
اصل تہذیب و تمدن احترامِ آدمی!

۵۹۰

تجھ کو ہے اے زندہ دل معلوم کیا ہے زندگی
عشق یک بیں جو ہے مصروفِ تماشائے دوئی

مرد و زن اک دوسرے کے ہم نفس، دمساز ہیں
کائناتِ شوق کے مظہر ہیں، وہ دمساز ہیں

پیکر زن پاسبانِ شعلۂ نارِ حیات
اس کی فطرت ہے طبیعی لوحِ اسرارِ حیات

وہ ہمارے شعلۂ سوزاں کو برقِ جاں بنائے
جوہرِ پاکیزہ اس کا خاک کو انساں بنائے

اس کی فطرت میں ہیں پنہاں ممکناتِ زندگی
ہے تب و تاب اس کی سامانِ ثباتِ زندگی

ایک شعلہ چھوٹتے ہیں جس کے پہلو سے شرار
گر نہ سوز اس کا ہو، جان و تن ہوں کیسے آشکار

اپنی شانِ ارجمندی ہے اسی کی آن سے!
سب ہماری نقشبندی اس کے جسم و جان سے

کی ہے ارزانی اگر حق نے تجھے تابِ نظر
دیکھ چشمِ پاک بیں سے اس کا پاکیزہ گہر

اے کہ عصرِ نو نے کر لی سلب تیرے دیں کی تاب
فاش کرتا ہوں میں تیرے دل پہ اسرارِ حجاب

لذتِ تخلیقِ آتش جسم و جاں میں شعلہ زن
اس کی آب و تاب ہی سے ہے فروغِ انجمن!

۶۰۰

بہرہ ور ہو کوئی بھی ہو اس مقدس آگ سے
آپ سوز و ساز کی اپنے نگہبانی کرے

ہر نفس رکھتا ہے اپنے نقش پر اپنی نظر
رہ روِ تا اس کی رہے بیگانۂ نقشِ دگر

مصطفٰے غارِ حرا میں ہو گئے خلوت گزیں
ایک مدت کچھ سوائے ذات کے دیکھا نہیں

ہو گئی دل پر ہمارے عکس کی صورت گری
ایک ملت ان کی خلوت سے نمایاں ہو گئی!

منکرِ یزداں تو ہو سکتا ہے کوئی آدمی
کیسے ہو سکتا ہے لیکن منکرِ شانِ نبی؟

خواہ تیری ذات نورانی ہو مانندِ کلیم
گر نہ ہو خلوت تو سب اذکار ہیں تیرے عقیم

ہے کم آمیزی سے ہی تخئیل انساں زندہ تر
زندہ تر، پاکیزہ تر، جوینده تر، تابنده تر!

علم اور طلب دونوں ہیں اسبابِ حیات
اپنے اپنے طور پر ہیں مستفیضِ واردات

علم کا مقصود اصلی لذتِ تحقیق ہے
اصل غایت عشق کی سرمستیٔ تخلیق ہے

صاحبِ تحقیق کو ہنگامۂ جلوت عزیز
صاحبِ تخلیق کو کاشانۂ خلوت عزیز

چشمِ موسیٰ تھی طلبگارِ تماشائے وجود
لذتِ تحقیق ہی سے اس طلب کی تھی نمود

لن[1] ترانی میں نہاں ہیں کتنے ہی نکتے دقیق
دیکھ لے ہو کر ذرا غوطہ زنِ بحرِ عمیق!

جس جگہ بھی جلوہ گر ہوتے ہیں آثارِ حیات
ان کا سرچشمہ ہے مکنونِ ضمیرِ کائنات

---

۱ - لن ترانی - قرآن (۷ - ۱۴۳) تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

دیکھ چشمِ غور سے ہنگامۂ آفاق کو　　زحمتِ جلوہ گری کیوں حضرتِ خلّاق کو

ہے فقط جلوت سے حفظِ ذاتِ ہر نقش آفریں
جوہرِ نایاب خلوت اس کے خاتم کا نگیں

۲۔ حکومتِ الٰہی

بندگانِ حق سراسر بے نیازِ ہر مقام　　وہ کسی کے کب غلام اور کون ہے ان کا غلام

بندۂ حق کچھ نہیں آزاد انساں کے سوا　　ملک و آئین اس کے ہیں فیاضِ مطلق کی عطا

اس کے سارے رسم و راہ و دین و آئیں حق سے ہیں　　جو بھی کچھ ہے زشت و خوب و تلخ و شیریں حق سے ہیں

عقلِ خود بیں کو کہاں پروائے بہبودِ جہاں　　دیکھتی ہے فائدہ اپنا نہ سودِ دیگراں

وحیٔ ربانی میں ہے سارے جہاں کی بہتری　　سود و بہبود اس کی نظروں میں تمام افراد کی

حق ہے ہر حالت میں عادل، صلح ہو چاہے مصاف　　وصل میں بھی فصل میں بھی لا یراعی لا یخاف[1]

غیرِ حق ہو جائے امر و نہی پر جب حکمراں　　ناتوانوں پر ہوں زور آور بلاشک قہرماں

اس جہاں میں آمریت کی بنا ہے قاہری
آمریتِ ماسوا اللہ کے ہے سب کا فری

۱۔ نہ کسی کی رعایت کرتا ہے نہ کسی سے ڈرتا ہے۔

قاہر آمر اگر چالاک ہو اور پختہ کار
باندھ لیتا ہے وہ اپنے گرد آئیں کا حصار

شاہبازِ اوج پیما تیز چنگ اور زود گیر
اپنے کاموں میں بنا لیتا ہے چڑیوں کو مشیر

قاہری کو اس طرح آئین اور دستور دے
آپ بے نور اور عطا بے نور کو سرمہ کرے

حاصلِ دستور و آئینِ سلاطیں ہے یہی
وہ خدا فربہ ہو دہقاں تکلے جیسے منحنی!

وائے اے دل! وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر ہے مردہ اس سے، حیف یہ صورِ فرنگ!

سب مقامر ہیں یہ مانندِ سپہرِ گرد گرد
تختۂ شطرنج ہے اور امتیں اشکالِ نرد

سب کے سب شاطر ہیں یہ زردار کیا مزدور کیا
ہر کوئی اک دوسرے کی گھات میں بیٹھا ہوا! ۶۳۰

کیوں نہ کر دوں میں بیاں بے پردہ سرِّ دلبراں
ہم سبھی مالِ تجارت اور یہ خیلِ تاجراں

کسقدر بے حس ہیں وہ! افسوس حبِ مال و زر
ماؤں کے دل پر گراں ہے کسقدر بارِ پسر

ہائے وہ اقوام جو تشویشِ برگ و بار سے
رشتۂ نم کاٹ دیتی ہیں تنِ اشجار سے!

جنبشِ زخمہ سے تا نکلے نہ نغمہ تار سے
گھونٹ دیتی ہیں دمِ اندر اُسکا بن ابھرے ہوئے!

گرچہ اس میں جلوہ گر ہیں نقش ہائے رنگ رنگ
میں نے جز عبرت نہ دیکھا کچھ بہ ایوانِ فرنگ!

اے کہ اس کا خوگرِ تقلید ہے آزاد ہو
دامنِ قرآں پکڑ لے اور شاد آباد ہو!

زمین خدا کی ملکیت ہے

سرگذشت انساں کی کیا ہے شرق ہو وہ خواہ غرب
اک زمیں کے واسطے ہیں فتنہ ہائے حرب و ضرب

اک عروس اور سینکڑوں شوہر عجب انداز ہے
سب کی ہوتے وہ کسی کی بھی نہیں دمساز ہے

اس کے عشوے، اسکی گھاتیں مکر و فن ہی مکر و فن
وہ نہ تیری ہے نہ میری نت نیا اس کا چلن!

کب موافق ہیں ترے یہ پا بگل سنگ و حجر
یہ ہیں اسبابِ حضر اور زندگی تیری سفر

اختلاطِ خفتہ و بیدار ہو سکتا ہے کیا؟
ارتباطِ ثابت و سیار ہو سکتا ہے کیا؟

حق نے فرمایا بس اتنا ہے زمیں ملکِ بشر
یہ متاعِ بے بہا ہے سرمۂ مفتِ نظر!

وہ خدا اک بات سن لے میری گوشِ ہوش سے
اس سے رزق و گور ہے لیکن اسے ہرگز نہ لے

تا بکے یہ صحبت اس کی، تو ہے بود اور وہ نبود
تو ہے سر تا پا وجود اور وہ نمودِ بے وجود

تو عقابِ پر کشا، اٹھ طائفِ افلاک ہو
کھولدے یہ بال و پر، خاکِ نجس سے پاک ہو

باطنِ الارض للہ ہے صریحاً آشکار.
جو نہ دیکھے یہ حقیقت کفر ہے اس کا شعار

میں نہیں کہتا کہ کر دو ترک یہ سب کاخ و کو
ہے تمہارا مایہ و دولت جہانِ رنگ و بو

دانہ موتی موتی اس کی خاک سے چنتے رہو
بازہ کی مانند یا صید آسمانوں پر کرو

تیشہ زن ہو اس کے کہساروں پہ سینہ تان کر
خود سے لیکر نور پھینکے جاؤ اس کی نار پہ

ہے طریقِ آذری وجہِ شکستِ آبرو
اک جہانِ نو تراشو حسبِ شوق و آرزو

رنگ و بو اور کاخ و کو کو دل نہ دو بہرِ خدا
دل امانت حق کی ہے، اس کو نہ دو حق کے سوا

کیا ہے مرنا بے سروسامان، بے گور و کفن
یہ کہ ہم کو جذب کر لیں نقرہ و فرزند و زن

حرفِ الا اللہ ہو جائے اگر وردِ زباں
اپنے اندر جذب کر لے آدمی سارا جہاں

سچ تو یہ ہے فقر جوع و رقص و عریانی نہیں
فقر اک طاقت ہے، سلطانی ہے رہبانی نہیں

۴ ۔ حکمت خیرِ کثیر ہے

حق کا یہ ارشاد ہے حکمت ہمہ خیرِ کثیر
جس جگہ یہ کانِ زر پائے، ہو اس سے مایہ گیر[1]

علم حرف و صوت کو کرتا ہے بال و پر عطا
جو نہیں گوہر اسے براقیِ گوہر عطا

علم تا اوجِ سپہرِ نیلگوں رکھتا ہے راہ
چھین لیتا ہے وہ مہر و ماہ سے تابِ نگاہ

نسخۂ اکسیر اس کا نسخۂ تفسیرِ کل
اس کی تدبیروں ہی سے وابستہ ہے تقدیرِ کل

دے حباب اے دشت، اگر کہہ دے تو وہ بخشے حباب
بن سراب اے بحر، کہہ دے تو وہ بن جائے سراب!

رکھتا ہے زیرِ نظر وہ وارداتِ کائنات
تا کہ ان سے اخذ کر لے محکماتِ کائنات

۱۔ گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ۔ ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر ۔ (رومی)

گر ہو وابستہ حقیقت سے تو وہ پیغمبری
ورنہ سارا کاروبارِ علم و حکمت کافری

علم کی بے سوزِ دل تحصیل کیا ہے؟ شرہی شر
روشنی اس کی فقط ظلمت فزائے بحر و بر

ایک دنیا اس کی گیسوؤں سے ہے کور اور تیرو تار
ہے خزانِ لالہ زارِ ہست و بود اس کی بہار

یہ سمندر، دشت و صحرا، کوہسار و باغ و راغ
اس کے طیاروں کی بمباری سے سارے داغ داغ

آگ بھڑکی ہے اسی سے سینۂ افرنگ میں
ہیں اسی سے تاخت و شبخوں کی ساری لذتیں

گردشِ معکوس کرتا ہے عطا ایام کو
اور غارت کرتا ہے سرمایۂ اقوام کو

کی ہے یاری قوتِ ابلیس کی جو اختیار
نور اس کا بن گیا ہے نار کی صحبت سے نار

خاتمہ ابلیس کا لیکن کوئی آساں نہیں
کیونکہ وہ گہرائیوں میں دل کی ہے گوشہ نشیں

ہے یہی بہتر اگر اس کو مسلماں کیجئے
کشتۂ شمشیر جوہر تابِ قرآں کیجئے

ہر جلالِ بے جمال آشوب، اس سے الاماں!
ہر فراقِ بے وصال آشوب! اس سے الاماں!

علم ہے بے عشق کیا، سرمایۂ طاغوتیاں
اور اگر با عشق ہو پیرایۂ لاہوتیاں!

علم و حکمت پیکرِ مردہ ہیں بے مہر و وفا
عقل و دانش تیر ہے لیکن ہدف تک نارسا

کور کو دیدار سے بینندۂ اسرار کر
بولہب کو سوزِ جاں سے حیدرِ کرار کر

زندہ رود

محکمات اس کے ہوئے گو کشف از روئے کتاب — پھر بھی یہ عالم ابھی ہے زیرِ دامانِ حجاب
اپنے چہرے سے یہ پردے کو ہٹاتا کیوں نہیں — یہ ہمارے قعرِ دل سے باہر آتا کیوں نہیں
ہم ہیں اور پیشِ نظر اک عالمِ فرسودہ ہے — ملت اس کی خاک کے پردے میں ہی آسودہ ہے
کردوں اور تاتاریوں کے دل کی حدت مٹ گئی — یا مسلماں مر گئے یا مر گیا قرآن ہی!

سعید حلیم پاشا

کفر سے بھی دینِ حق صد حیف رسواتر ہے آج — کیونکہ ہر ملّا بزورِ فتویٰ کافر گر ہے آج!
اپنی شبنم ہے نگاہوں میں ہماری یم ہی یم — چشمِ ملّا میں ہمارا یم ہے شبنم سے بھی کم!
ہائے کیا کیا رنگ دکھلاتا ہے یہ قرآں فروش — دیکھ کر روح الامیں ہو جس کو مصروفِ خروش
چرخ کے اس پار سے دِل اس قدر بیگانہ ہے — اس کی فکرِ خام میں قرآنِ پاک افسانہ ہے
بے نصیب جلوہ ہائے حکمتِ دینِ نبی — آسماں اس کا ہے تاریک اور تاروں سے تہی
حیف مردِ کم نگاہ و کور ذہن و ہرزہ گرد — جس کی قیل و قال سے ارکانِ ملّت فرد فرد!

مکتب و ملا کہاں اور درکِ اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد کو کیا حسنِ نورِ آفتاب

دینِ اہلِ کفر کیا ہے فکر و تدبیرِ جہاد!
اور ملّا کا عقیدہ فی سبیل اللہ فساد!

بندۂ صدق و صفا، جانِ جہانِ حق کا امیں
اس سے کہہ جا کر مری جان ہے اے خلوت نشیں

اے ترے افکار سے اربابِ ایماں کی حیات
اے ترے انفاس سے اعضائے ملت کو ثبات

حفظِ قرآں میں مشرب ترا، آئیں ترا
حرفِ حق کا برملا اعلان ہی ہے دیں ترا

تو کلیم اللہ ہے کب تک رہے گا پائمال
آستیں سے دستِ معجز آفریں باہر نکال

والہانہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سنا
اور غزالوں کو بتا دے وسعتِ صحرا ہے کیا ۶۹۰

تیری فطرت ہے چراغِ مصطفٰے سے مستنیر
آ بتا دے کیا مقام اپنا ہے اے روشن ضمیر

مردِ حق کرتا ہے حق سے اکتسابِ رنگ و بو
کب کرے اوروں سے اس جنسِ گراں کی جستجو

ہر نفس اس کے بدن میں شعلہ زن جاں اور ہے
مثلِ حق ہے اور ہی شانٔ اس کی عنواں اور ہے

مردِ مومن کو بتا دے پھر وہی رازوں کا راز
کلَّ یومٍ کے رموز و نکتہ ہائے دل نواز

جز حرم ہے کاروانِ شوق کی منزل کہاں
غیرِ حق رکھتا نہیں سینے میں اپنا کارواں!

میں نہیں کہتا کہ اس کا راستہ کچھ اور ہے
کارواں ہی اور ہے اس کی نگہ کچھ اور ہے۔

افغانی

اس حدیثِ مصطفےٰ سے کیا ہے آگاہی نصیب؛
یہ کہ ہے معمورۂ عالم میں دینِ حق غریب![۱]

اس اچھوتی بات کے معنی بتاتا ہوں تجھے
غربتِ دیں مختلف ہے فقرِ اہلِ ذکر سے

ایسی ہستی کے لیے ہو جستجو جس کا شعار
غربتِ دیں ندرتِ آیات کا ہے جلوہ زار

غربتِ دیں دمبدم، ہر ہر زماں نوعِ دگر
پائے اس باریک نکتے کو جو ہے صاحب نظر

کر سکے تا عصرِ حاضر کو گرفتارِ کمند
دل کو آیاتِ مبیں کی تاب سے کر بہرہ مند

ہوں الم نشرح کسی پر کیسے اسرارِ کتاب
مشرقی اور مغربی ہیں مبتلائے پیچ و تاب

روس کا اپنے یہاں وہ طرحِ نو کا اہتمام
کاروبارِ آب و ناں میں دین کا قصہ تمام!

حق ہی دیکھ اور حق ہی مانگ اور ڈھونڈ حق ہی حق تمام
اور پہنچا دے مرا پیغام اس ملت کے نام

۱- الاسلام جاء غریب

ملت روسیہ کو افغانی کا پیغام

منزلِ مقصودِ قرآں تو ادھر کچھ اور ہے — رسم و آئینِ مسلماناں مگر کچھ اور ہے
سینے میں وہ آتشِ سوزاں کی لو باقی نہیں — مصطفےٰ کی روح کی یک شمہ ضو باقی نہیں
بندۂ مومن نے قرآں سے نہ کچھ حاصل کیا — خُم میں مے باقی نہ تلچھٹ کا نشاں باقی رہا!
خود ہی توڑا قیصر و کسریٰ کی سطوت کا طلسم — اور خود ہی تختِ سلطانی کا پھر باندھا طلسم
جب نہالِ سلطنت نشو و نما پا کر بڑھا — اس پہ نقشِ بادشاہی سایہ بن کر چھا گیا

یہ ملوکیت وہ ہے جس سے بدل جائے نظر
عقل و ہوش اور رسم و راہِ قوم ہوں نوعِ دگر

اے کہ تو نے طرحِ نو ڈالی بصد جوش و خروش — خود کو دستورِ کہن سے کر دیا بیگانہ کوش
ہم مسلمانوں کی صورت تو نے بھی یورش کناں — قیصریت کے شکستہ کر دیے ہیں استخواں!
تا کرے دل میں فروزاں اپنے اک تازہ چراغ — لے ہماری سرگذشتِ غم سے عبرت کا سراغ
بازوں مضبوطی سے رکھ اپنے میانِ کارزار — گردابِ لات و ہبل کے گھوم مت دیوانہ وار
اپنی ملت پر نظر ہے اس جہانِ پیر کی — جو دلائے خوف بھی اور دے نوید خیر بھی!

لوٹ آئیں پھر قدم تیرے سوئے اقوامِ شرق
بسکہ ہے دامن ترا وابستۂ ایامِ شرق

تو نے ڈالا جاں میں اک تازہ شرر، سوزِ دگر
ہیں ترے سینے میں آسودہ شبِ دردِ دگر

ہو گئے فرسودہ سب افرنگ کے آئین و دیں
دیکھے اس دیرِ کہن کو کیوں نگاہِ نکتہ بیں؟

سب خداوندوں کا تو نے کر دیا قصہ تمام
اب گذر جا لا سے اور کر جانبِ الا خرام

ہاں گذر جا لا سے گر تیری نظر جوینده ہے
جب تلک اثبات کی رہ پر چلے تو زندہ ہے ۷۲۰

اے کہ تو خواہاں ہے رائج ہو یہاں تازہ نظام
تو نے کیا ڈھونڈی ہے بنیاد اس کی محکم، بالدوام؟

داستانِ کہنہ کو دھو ڈالا تو نے باب باب
فکر کو تیری جلا دے کیوں نہ اب ام الکتاب

مشک خاموں کو یدِ بیضا دیا کس نے دیا؟
مژدۂ لا قیصر و کسریٰ دیا، کس نے دیا؟

موڑ دے منہ کچھ نہیں یہ جلوہ ہائے رنگ رنگ
پالے اپنے آپ کو تج کر رہ و رسمِ فرنگ

اہلِ مغرب کے مکائد کا اگر ہے راز دار!
چھوڑ دے روباہی، شیری کو بنا اپنا شعار

کیا ہے روباہی، تلاشِ جاہ و حشمت، سازِ مرگ
شیر مولا ہے فقط، جویائے آزادی و مرگ[1]!

ضیغمی بے زورِ قرآں کچھ نہیں جز روبہی
اور قرآنی فقیری قیصری، شاہنشہی

فکرِ قرآں اختلاطِ باہمی ذکر و فکر
فکرِ کامل کا نہیں امکاں بلا امدادِ ذکر

۱- شیر مولا جوید آزادی و مرگ (رومی)

نام ہے ذکر اعتدالِ ذوق و عقل و ہوش کا
کام ہے یہ جان بوکھوں کا نہ خورد و نوش کا

اس سے ہو جاتی ہے سینوں میں اک آتش شعلہ بار
گو نہیں تیری طبیعت سے ابھی یہ سازگار

اے کہ تیرا دل ہے شیدائے بتِ رعنائے فکر
میں بتاتا ہوں تجھے کیا ہیں تجلی ہائے فکر

کیا ہے قرآں؟ اہلِ سرمایہ کو ہے پیغام مرگ
دستگیرِ بندۂ بے چارہ و بے ساز و برگ!

خیر کا سرمایہ داروں سے بھلا کیا آسرا
لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا[1] ہے فیصلہ!

سود سے ہوتا ہے کیا پیدا بجز شر و فساد
لذتِ قرضِ حسن کی کون اب دیتا ہے داد

سود سے جانیں سیہ اور دل مثالِ خشت و سنگ
آدمی درّندہ ہو جاتا ہے بے دندان و چنگ

رزق لے لینا ہے بطنِ خاک سے بالکل بجا
یہ زمیں کیا ہے متاعِ بندگانِ ملکِ خدا

بندۂ مومن امیں ہے اور مالک کردگار
غیرِ حق جو کچھ بھی ہے، فانی ہے اور ناپائدار

رایتِ حق کو نگوں کرتے ہیں شاہانِ جہاں
بستیوں کی بستیاں ان کی بدولت بے نشاں

آب و ناں ہے ایک دسترخواں سے ہر انسان کا
دودماں آدم کا ہے یعنی کہ نفسِ واحدہ[2]

۱- لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا ممّا تحبون (تم خیر کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے تاوقتیکہ اپنی پیاری چیز کا ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ ۲- قرآن: ما خلقکم ولا بعثکم الخ

نقشِ قرآنی جہاں پر جب سے مستولی ہوا
کاہن و پاپا کا سارا نقش باطل ہو گیا!

برملا کہتا ہوں سینے میں مرے جو راز ہے
کیا کتاب اس کو کہیں یہ نقش ہے کچھ اور شے!

جان میں جائے تو ہو جاتا ہے جاں کا رنگ اور
جاں بدل جائے تو ہوتا ہے جہاں کا ڈھنگ اور!

مثلِ حق یہ نقشِ حق پنہاں بھی ہے پیدا بھی ہے
زندہ و پائندہ ہے خاموش بھی گویا بھی ہے!

اس کے سینے میں نہاں تقدیرہائے غرب و شرق
دیکھ لے تجھ میں اگر ہو تیز دانش مثلِ برق!

دی مسلماں کو ہدایت سر بکف پیہم رہے
جو بھی حاجت سے فزوں ہو دوسروں کو بخشدے

شرع دے آئیں اور پیدا کر دیئے تو نے مگر!
روشنی میں کر ذرا قرآن کی ان پر نظر!

تاکہ تو ہو جائے آگاہِ بم و زیرِ حیات
آشکارا تیری نظروں پر ہو تقدیرِ حیات

انجمن اپنی اگر بے ساقی و مے ہے تو کیا!
سازِ قرآں میں تو باقی ہے ابھی حشر نوا!

کیا ہے گر ثابت ہوا زخمہ ہمارا بے اثر!
ہیں تہِ گردونِ گرداں اور لاکھوں زخمہ ور!

۱- قرآن، (۲ : ۲۲۵): ویسئلونک ماذا ینفقون (اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں)

سلسلہ ہے ذکرِ حق کا بے نیازِ امتحاں
سر بسر آزادۂ بندِ زماں، قیدِ مکاں!

ذکرِ حق ہے ذکرِ ہر ذاکر سے آزاد اور جدا
مصر و روم و شام سب سے بے نیاز اور ماورا

ہم سے حق گر اپنا یہ بارِ امانت چھین لے
دوسری اقوام کو وہ لامحالہ سونپ دے

دیکھتا ہوں میں مسلمانوں میں تقلید و قیاس
ہر گھڑی رہتے ہیں لرزاں جسم و جاں ہوش و حواس

مجھ کو اندیشہ ہے یہ دولت نہ چھن جائے کہیں
بخشدے اوروں کو حق اپنی متاعِ آتشیں!

پیرِ رومی زندہ رود سے کلام کی فرمائش کرتے ہیں

مرشدِ رومی وہ پیکر وجد و درد و جذب کا
اس سخن نے یک بیک جانے اسے کیا کر دیا!

اس کے دل سے نکلی آہِ جانگزا بے اختیار
آنکھیں بھی خونِ شہیداں سے تھیں بڑھ کر لالہ گاں

بسکہ مہرِ اہلِ دل تھے اس کے تیرِ نشتریں
اس لئے اس کی نگاہیں سوئے افغانی اٹھیں

بولے "دل کو جوں شفق خوں میں ڈبونا چاہیئے
حق سے پیمانِ وفا مضبوط ہونا چاہیئے

جان ہے امید ہی سے صورتِ جوئے رواں
ترک کر دنیا امیدوں کا ہے مرگِ جاوداں[1]!

۱- جاں ز امید است چوں جوئے رواں ۔ ترکِ امید است مرگِ جاوداں (رومی)

پھر مری جانب نظر کی اور کہا "اے زندہ رود!
ایک دو شعروں سے کر دے مشتعل میرا وجود

اپنا ناقہ خستہ جاں اور اسقدر محمل گراں
تلخ تر سے تلخ تر، بہتر نوائے ساربان

امتحانِ پاک مرداں محشرستانِ بلا
تشنگاں کو تشنہ تر کرنا روا، برحق بجا

پار کر جاناں کلیم اللہ بن کر رودِ نیل
بے محابا پھاند جا تو آگ کو مثلِ خلیل!

نغمہ ایسے شخص کا جس میں ہو پنہاں بوئے دوست
ساری ملت کو اڑا لے جاتا ہے تا کوئے دوست"

زندہ رود کی غزل

لالہ و گل جو بظاہر نظر آتے ہیں مقیم
راہ پیماؤں میں مسلسل صفتِ موجِ نسیم

معنیٔ تازہ کہاں جن کی طلب ہے تم کو
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں سارے ہی عقیم

اپنے اندر سے نکال آگ اور اس میں جل جا
خانقاہوں میں تو ہر شخص ہے بے سوزِ کلیم

کیا صفا کوشی ہے ان تکیہ نشینوں کی نہ کہہ
ملگجے الجھے ہوئے بال ہیں بوسیدہ گلیم

اک حرم میں ہی حرم کتنے بنا رکھے ہیں
اہلِ توحید یک اندیش ہیں اور پھر بھی دو نیم

نہیں یہ بات کہ محفل میں نہیں جذبہ و جوش
رونا اس کا ہے کہ سب لوگ ہیں بے نقل و ندیم

فلکِ زہرہ

فلکِ زہرہ

ہم سے پیکر تا تجلی گاہِ قربِ آفتاب
ہیں فضائے تو بہ تو میں کتنے ہی حائل حجاب

پردے ہی پردے ہمارے آگے لٹکائے گئے
آتشیں جلوے جو کچھ تھے ان سے چھنوائے گئے

تاکہ جتنا سوز کم ہو اتنے ہی دل سوز ہوں
شاخ و برگ و بر کو راس آئیں جہاں افروز ہوں

دوڑے ان کی تاب سے رگ ہائے لالہ میں لہو
والہانہ رقص سے سیماب گوں ہو آب جو!

ہو یونہی روحِ رواں بھی پرفشاں بالائے خاک
خود ہی بے سوئی کی جانب اڑتی جائے جانِ پاک

راہ میں رہ رہ کے اسکے مرگ و حشر اور حشر و مرگ
جز تب و تاب اس کے سینے میں نہیں ہے ساز و برگ!

موج بر موجِ فضائے صد سپہرِ نیل فام
غوطہ زن ہو ہو کے اس میں لوٹ لوٹ آئے مدام

وہ حرم آپ اپنا ہے اور آپ ابراہیم بھی
ہے ذبیح اللہ کی صورت ہمہ تسلیم بھی!

مثلِ خیبر نہ حصارِ آسماں اس کے لئے
ضرب اس کی ہے مقامِ حیدرِ کرار سے

رزم اور حرب دمادم پاک کرتا ہے اسے!
محکم و سیار اور چالاک کرتا ہے اسے!

ہیں اڑانیں اس کی درانہ بصد پہنائے نور
پنجۂ بے باک ہے گیرندۂ گیسوئے حور

تاکہ مازاغ البصر کی شان سے ہو بہرہ ور
ہے مقامِ عبدہٗ پہ دسترس پیشِ نظر

کیا ہے خود میرا مقام، اس کی نہیں مجھ کو خبر
ہوں جدا اوروں سے، بس میں جانتا ہوں اس قدر

میرے سینے میں بپا ہے جنگ بے خیل و سپاہ
دیکھ سکتا ہے وہی جو مجھ سی رکھتا ہو نگاہ

دوسرے کیا جانیں یہ پیکار و رزمِ کفر و دیں
جانِ تنہا ہے مری مانند زین العابدیں!

کون ہے وہ جو مقام و راہ سے آگاہ ہے؟
کون جز میری نوا کے ان کی شمع راہ ہے!

غرق دریا ہو گئے کیا طفل کیا برنا و پیر
جاں سلامت لے گیا تا ساحل اک مردِ فقیر!

پردے محمل کے ہٹائے والہانہ بار بار!
وصل کا دھڑکا بھی تھا فرقت سے بھی دل بیقرار

وصل ہو گر شوق کا انجام اس سے الحذر
ہائے کتنی خوب ہے آہ و فغانِ بے اثر!

کیا غرض رہرو کو ڈھونڈے اپنی راہوں کا سراغ
اس کی جاں کو سازگار آئے اگر ذوقِ فراغ

میرا دل؟ وہ دل کہ ہے وارفتۂ ذوقِ نظر
ہر گھڑی رکھتا ہے ارمانِ جہانِ تازہ تر!

رومی نے جو تھے مرے احوالِ جاں سے بے خبر
یوں کہا، "یہ لو اگر ہے شوقِ دنیائے دگر!

عشق اک شاطر ہے، ہم مہرے ہیں اس کے ہاتھ میں
خانۂ زہرہ میں ہیں ہم، دیکھ لے اس کی حدیں

اک جہاں ہے جس کا پانی اور مٹی سے قوام
ہے نہاں مثلِ حرم زیرِ غلافِ مشک فام

اک نگاہِ بے محابا پردہ سوز و پردہ در
لے کے اس کے بادلوں اور دھند سے آگے گذر

ا- قرآن (۱۷-۵۳) و ما زاغ البصر و ما طغیٰ - لقد رأیٰ من آیات ربه (نہ تو آپ کی نگاہ میں کجی پیدا ہوئی اور نہ وہ حد سے آگے بڑھی۔

اس میں دیکھے گا خدایانِ کہن کی انجمن
میں انہیں پہچانتا ہوں نام وار اور تن بہ تن

یہ ہے بعل اور وہ ہیں مردوخ و یعوق و نسر و فسر
یہ ہے رم خن اور وہ لات و منات و عسر و غسر
پیش کرتے ہیں یہ اپنی پائداری پہ دلیل
دورِ حاضر ہے مزاجاً ایک دورِ بے خلیل"

خدایانِ قدیم کی انجمن

وہ ہوائیں تند و تیز اور تار و تیرہ وہ سحاب
برق بھی تاریکیوں میں جس کی ہو محرومِ تاب!

اک سمندر موجزن گویا ہوا کے درمیاں
چاک داماں اور پھر بھی اتنا کم گوہر فشاں!

اس کا ساحل ناپدید اور تند موجیں گرم خیز
باوجود اس کے بہت ہی کم ہواؤں سے ستیز!

رومی اور میں دونوں اس دنیائے ظلمت میں اسیر
جس طرح افکار ہوں محبوسِ زندانِ ضمیر

وہ جہاں پہلئے دیرینہ مگر میں نوسفر
دونوں آنکھوں میں مری بے چین تھی پیہم نظر

کہہ رہا تھا ہر گھڑی میری نظر ہے نارسا
یہ کدھر ہے کس جگہ یہ دوسرا عالم نیا؟

رفتہ رفتہ ہو گئے پیدا پہاڑوں کے نشاں
اے خوشا وہ جوئباروں، مرغزاروں کا سماں

کوہ و صحرا زیر و بالا، صد بہار اندر بہار!
مشکبار آتی تھی کیا موجِ نسیمِ کوہسار!

غلغلہ زا نغمہ ہائے طائرانِ ہم نفس — ہر قدم پر چشمہ زار اور سبزہ ہائے نیم رس

جسمِ اعجازِ ہوا کے فیض سے پائندہ تر — پیکرِ فانی میں جانِ پاک تھی بینندہ تر!

کوہ کی چوٹی سے ڈالی ہیں نے ہر جانب نظر — کس قدر شاداب تھے کوہ و کمر اور دشت و در!

دلکشا ہموار وادی بے نشیب و بے فراز — آبِ خضر اس خاک کے آگے بجا لائے نیاز

اس سراپا کیف وادی میں خدایانِ کہن — اک خدائے وادیٔ نیل اور اک ربِّ یمن

اک خدایانِ عرب سے اور اک ربِّ عراق — یہ الٰہ الوصل اور وہ دوسرا ربّ الفراق

ایک نسلِ مہر سے، رشتے میں وہ زوجِ قمر[1] — اس کی زوجِ مشتری کی سمت تھی مائل نظر

ایک کے ہاتھوں میں تھی سونتی ہوئی تیغِ دودم[2] — اور گلے میں دوسرے کے مارِ پیچاں[3] خم بہ خم!

دونوں کو وجہ ہراس جاوداں، ذکرِ جمیل — دونوں آزردہ کہ وائے ضربِ بازوئے خلیل!

نعرہ زن مردِ رخ آدم حق سے رو گرداں ہوا — اور کلیسا و حرم دونوں ہی سے نالاں ہوا

تاکہ روشن تر ہوں اس مشعل سے اور اک و نظر — سوئے عہدِ رفتہ اس نے رخ کیا بارِ دگر!

ہے یہ ذوق و شوق لذت گیر آثارِ کہن — ہے ہماری ہی تجلی اس کا موضوعِ سخن!

باب دوراں نے کیا اک اور افسانے کا وا — پھر چلی یادِ مراد اس خاکداں سے مرحبا

لعل کے ہونٹوں پہ تھے فرطِ طرب سے زمزمے

اس نے مجلس پر ہمارے راز یوں افشا کیے

۱- سورج بنسی اور چندر بنسی۔ ۲- ہندو تری مورتی کا تیسرا خدا جو ہر وقت فنا کرتا رہتا ہے۔ ۳- مہادیو

نغمۂ لعل

چاک کر ڈالے بشر نے پردہ ہائے آسماں
پا سکا لیکن نہ گردوں سے پرے حق کا نشاں

ہے دلِ انساں میں جز ہنگامۂ افکار کیا
موج کی صورت کوئی ابھرا کوئی پنہاں ہوا

اس کی جاں پاتی ہے تسکیں پیکرِ محسوس سے
کیا عجب گر لوٹ آئے پھر سے عہدِ پاستاں

تا ابد جیتا رہے افرنگیٔ مشرق شناس
پھینک کر جس نے لحد سے ہم کو بخشی تازہ جاں

دور ہے، دوروں کا دور اب اے خدایانِ کہن

دیکھنا ہاں دیکھنا پھر نقشِ وحدت کی شکست
آلِ ابراہیم ہے بیگانۂ ذوقِ الست!

اس کی صحبت منتشر، جام و سبو صد پارہ ہیں
جو مئے کیف آورِ جبریل کا تھا شیر مست

بندۂ آزاد اسیرِ قید و بندِ شش جہات
ہے پرستارِ وطن، حق ہے گریزاں، دور دست!

رونقِ بت خانہ سے خوں سرد ہو کر رہ گیا
ہو گیا ہے اسلئے پیرِ حرم بھی بت پرست!

دور ہے، دوروں کا دور اب اے خدایانِ کہن

لوٹ کر آئے جہاں میں پھر سے ایامِ طرب
ہو گیا ہے دیں ہزیمت خوردۂ ملک و نسب

اب چراغِ مصطفٰےؐ سے ہو کسی کو خوف کیا
اس کو پھونکیں مارتے ہیں آج سو سو بولہب

گوش زد ہوتی ہے اب بھی گو صدائے لا الٰہ
جب نہیں اسکی جگہ دل میں تو پھر کیا وردِ لب

جادوئے مغرب سے زندہ ہو گیا پھر اہرمن
روزِ یزداں زرد ہے یکسر ہو جیسے بیمِ شب

دور ہے، دوروں کا دور اب اے خدایانِ کہن

ہے بجا گر کھول دیں گردن سے اسکی بندِ دیں
اپنے بندے پہ کبھی پابندیاں عائد نہ تھیں

بسکہ ہے عرضِ صلوٰت اس کی طبیعت پر گراں
چاہئیے بے سجدہ رکعت ہو سہولت آفریں

کیفِ نغمہ کرتا ہے رفعت عطا جذبات کو
طاعتِ بے سازہ ہو سکتی ہے کیسے دلنشیں!

وہ خدا جو تا ابد پردہ نشینِ غیب ہو
اس سے بہتر ظاہر و باہر کوئی دیوِ گلیں

دور ہے، دوروں کا دور اب اے خدایانِ کہن

دریائے زہرہ میں غوطہ زن ہو کر فرعون اور کچنر کی روحوں سے ملاقات

پیرِ رومی وہ سراسر صاحبِ ذکرِ جمیل
جس کی ضربِ آہنی میں سطوتِ ضربِ خلیل

عالمِ مستی میں گائی اس نے اپنی یہ غزل
گر گئے سجدے میں سنتے ہی جسے لات و ہبل

غزل

پھر رفتہ و آئندہ پہ لازم ہے نظر ہو
اٹھو کہ سرِ فکر و نظر بارِ دگر ہو!

آرائستہ کر ناقۂ ایام پہ محمل
عاشق ہے تو رہوارِ ترا شام و سحر ہو

ہر دم متغیر ہے روشِ سبکہ جہاں کی
اس کے خوش و ناخوش سے نہ کیوں قطعِ نظر ہو

تو ترکِ جہاں کر کے ہے جویا جو خدا کا
پہلے تو یہ لازم ہے خود اپنے سے حذر ہو

میں نے کہا دل میں مرے صدلات و ہبل ہیں
فرمایا کہ یہ بتکدہ سب زیر و زبر ہو

پھر نہ راہِ لطف فرمایا کہ چل اٹھائے پیر
میرا ہی دامن پکڑ، آگے بڑھا پائے سفر

دیکھ یہ کوہِ گراں، یہ کوہسارِ بے کلیمؑ
برف کے تودوں سے جو لگتا ہے اک انبارِ سیم

اس کے پیچھے اک سمندر بے کراں، الماس گوں
ہیں نمایاں تہ بروں سے جس کے احوالِ دروں

اس کے سینے میں نہیں سیل و تلاطم سے خلل
ہے نہاں اس کی طبیعت میں سکونِ لم یزل

یہ مقامِ بود و باشِ سرکشانِ زور مست
مرزبومِ منکرانِ غائب و حاضر پرست!

ایک مشرق اور اک دنیائے مغرب کا مکیں
مستقل دونوں ہی کا مردانِ حق سے رزم و کیں

ان میں سے ہے ایک کی گردن تہِ چوبِ کلیمؑ
اور اک کا تیغ سے درویش کی پیکر دو نیم

دونوں فرعونِ زمانہ، یہ صغیر اور وہ کبیر
عین دریا میں مگر دونوں کے دونوں تشنہ میر!

کون ہے جو موت کی تلخی سے ہے ناآشنا
موتیں جباروں کی پر ہوتی ہیں آیاتِ خدا

بند کر کے آنکھیں چل پڑ میرے پیچھے اور نہ ڈر
ہاتھ دے ہاتھوں میں میرے اور کوئی غم نہ کر!

مثلِ موسیٰ سینۂ دریا کو میں دیتا ہوں چیر
تجھ کو دکھلاتا ہوں لے جا کر ابھی اُس کا ضمیر"

بحر نے ہم پر کیا سینے کو اپنے بے نقاب
جیسے وہ تھا تو ہوا لیکن نظر آتا تھا آب

قعرِ تختہ بندِ اُس کا وادیِ بے رنگ و بو!
اور تاریکی مسلسل تہ بہ تہ اور تو بہ تو!

پیرِ رومی نے کچھ ایسے سورتِ طٰہٰ پڑھی
قعرِ دریا میں اتر آیا ہمک کر چاند بھی!

اجلے اجلے کوہ پھیلے، صاف عریاں سرد سرد
ان میں دو حیراں پریشاں مضطرب مرگشتہ مرد

پہلے تو دونوں نے ڈالی پیرِ رومی پر نظر
اور پھر تکنے لگے اک دوسرے کو چونک کر!

بول اٹھا فرعونؔ ہائیں یہ سحر! یہ جوئے نور
یہ سحر آئی کہاں سے اور یہ نور و ظہور؟

رومی

جو بھی پنہاں ہے اسی کی لو سے ہے جلوہ نما
منبع و مخرجِ یدِ بیضا ہے اس تنویر کا!

فرعون

ہائے میں نے نقدِ عقل و دیں گنوایا آہ! آہ!
دیکھ کر بھی نور اندھی رہ گئی میری نگاہ!

اے جہاندارو! مجھے دیکھو، مجھے دیکھو مجھے!
اے زیاں کارو! مجھے دیکھو، مجھے دیکھو مجھے!

ہائے وہ ملت کہ ہو فرطِ ہوس سے دیدہ کور
اور اڑائے لعل و گوہر دفنِ خاکِ سردِ گور

جو بھی پیکر رونق افروزِ عجائب خانہ ہے
مضطرب اس کے لبِ خاموش پر افسانہ ہے

وہ ملوکیت کی ہر انساں کو دیتا ہے خبر
کور چشموں کو عطا کرتا ہے اعجازِ نظر ۸۷۰

کیا ہے تقدیرِ ملوکیت؟ تشتتُ الشقاق!
استواری کے لئے ہر گونہ سامانِ نفاق

اس بد آموزی سے ہوتی ہے زبوں تقدیرِ ملک
باطل و آشفتہ ہو جاتی ہے ہر تدبیرِ ملک!

پھر اگر قسمت سے مل جائیں کلیم اللہ مجھے
کہدوں للہ بخش دیجے اک دلِ آگہ مجھے!

رومی

نورِ جاں جب تک نہ ہو کارِ جہانبانی ہے خام
بے یدِ بیضا ملوکیت کی ہر صورت حرام!

ضعفِ محکوماں پہ ہے حاکم قوت کا مدار
بیخ ہے حرمانِ محکوماں سے اس کی استوار

تاج کا سرمایہ کیا ہے؟ باج و تسلیمِ خراج
آدمی پتھر کا بھی ہو تو وہ بن جائے نہ جاج

فوج، نہ نداں، طوق، نہ زنجیریں سراسر رہزنی
در حقیقت ہے وہی حاکم جو ہو ان سے غنی

ذوالخرطوم

مقصدِ قومِ فرنگ اس سے کہیں ہے شاندار
لعل و گوہر کے لئے کھودے نہیں اس نے مزار

سرگذشتِ پاستانِ مصر و فرعون و کلیم
جاننا ہو جس کو دیکھے جا کے آثارِ قدیم!

مقصدِ حکمت تلاشِ پیہم اسرار ہے
بے مذاقِ جستجو حکمت زبون و خوار ہے! ۸۸۰

فرعون

علم و حکمت کے لئے کھودے گئے بیشک مزار
تربتِ مہدی سے لیکن کیا ملا پایانِ کار؟

درویشِ سوڈانی کا ظہور

برق بے تابانہ کوندی اور تڑپی زیرِ آب
موجیں اٹھیں اور گریں کھاتی ہوئی پیچ و تاب

آئی جنت کے بیابانوں سے پوئے جانفزا
روح اس درویشِ مصری کی ہوئی جلوہ نما

سوز سے اس کے صدف میں پگھلے دُرِ آبدار
اور سنگِ سینۂ کچز بھی پگھلا موم وار!

بولا "اے کچز اگر تجھ میں بصیرت کا ہے نام
دیکھ خاکِ بندۂ درویش کا بھی انتقام

آسماں نے تیری مٹی کو نہ بخشی جائے گور
کوئی مرقد بھی نہ بخشا جز بہ قعرِ آبِ شور!"

رہ گئی اس کے گلے میں گھٹ کے پھر تابِ نوا
لب سے لیکن آہ بن کر نکلی اک غمگیں صدا

اک پکار اک چیخ "اے روحِ عرب بیدار ہو!
اپنے آبا کی طرح پھر خالقِ اعصار ہو!

فخرِ اعراب، اے فؤاد اے فیصل اے ابنِ سعود
کب تک اپنے آپ پر ہی اینٹھنا یوں مثلِ دود!

سوز سینوں میں کرو پیدا جو اب مفقود ہے
لاؤ وہ دن پھر جہاں میں آج جو نابود ہے! ۸۹۰

خاکِ بطحا پھر نیا خالد بروئے کار لا!
گونج اٹھے پھر جہاں میں غلغلہ توحید کا

نخل تیرے دشت کے بالندہ تر ہیں سو لبسو
خلق کیوں کرتی نہیں پھر دوسرا فاروق تو؟

اے حیات آگیں جہانِ مومنانِ مشک فام
خاک سے تیری مجھے آتی ہے خوشبوئے دوام

یہ جہانِ پا بگل، یہ زندگی بے ذوقِ سیر
تا بکے سررشتۂ تقدیر وقفِ دستِ غیر؟

تا بکے اپنے مقامِ اوج سے بے گانگی!!
موجِ یم میں ہڈیاں نالاں رہیں کب تک مری

لو ہراساں ہے بلا سے؟ سن حدیثِ مصطفےٰ
آدمی کے واسطے روزِ بلا روزِ صفا!

سارباں! سب دوست شیرب میں ہیں اور ہم نجد میں
وہ حدی اے کاش جو ناقے کو لائے وجد میں!

بارشیں برسیں، ہوئیں ساری زمینیں سبزہ زار
پائے ناقہ ہو گئے شاید کہ سستی کا شکار!

کسقدر دردِ جدائی سے ہے نالاں جانِ زار
جس پہ سبزہ کم ہو رستہ کر وہی تو اختیار

ناقہ مستِ کیف سبزہ اور میں مستِ دوست ہوں
وہ ترے ہاتھوں میں ہے اور میں بدستِ دوست ہوں ...

دیکھ پانی کس طرح ہے بہرِ صحرا سلسبیل
اور پہاڑوں پر ڈھلے ہیں کیسے اوراقِ نخیل

دو ہرن ہیں آگے پیچھے کیسے مستانہ رواں
اونچے ٹیلے سے چلے آتے ہیں نیچے رم کناں

چشمۂ صحرا سے پیتے ہیں وہ پانی اک دو دم
سر اٹھا کر تکتے ہیں پھر سوئے رہ پیما بہم

ہے نمی سے ریت صحرا کی مثالِ پرنیاں
راہ چلتے میں نہیں ہوتی یہ اونٹوں پر گراں

تیتروں کے پنکھ جیسی چتلی چتلی بدلیاں
دور ہے منزل نہ بارش ہو کہیں آزار جاں

سارباں سب دوست یثرب میں ہیں اور ہم نجد میں
وہ حدی اے کاش! جو ناقے کو لائے وجد میں!

فلکِ مرّیخ

اہلِ مرّیخ

اپنی آنکھیں بند کیں اک لحظہ میں نے زیرِ آب — اک ذرا خود کو جدا خود سے کیا مانندِ خواب
اور ہی دنیا میں پہنچا باندھ کر رختِ سفر — اور ہی جس کا زماں جس کا مکاں جائے دگر!
آفتاب اپنا رسا اس کے کناروں تک دیے — روز و شب ڈھلے ہیں اس کے اور ہی انداز سے
اجنبی ہے رسم و راہِ جہاں سے تن بیگانہ ہے — گو زماں میں ہے مگر پھر بھی زمن بیگانہ ہے ۹۲
سوز، کیسا سوز بھی ہو اس سے جاں کا ساز ہے — روز کیسا بھی ہو خوش خوش زمزمہ پرداز ہے
اس کو فرسودہ نہیں کرتی کبھی پروازِ روز! — بلکہ ہر روز اس کا تابانی سے ہے عالم فروز

روز و شب کی گردشِ پیہم اسی کے دم سے ہے
سیر کر ان میں کہ ہر عالم اسی کے دم سے ہے

مرغزار آیا نظر جس میں رصدگاہِ بلند — دور بیں گیرائی میں جس کی ثریا در کمند!
کیا کوئی خلوت گہِ نہ گنبدِ مینا ہے یہ؟ — یا سوادِ خاکدانِ سفلیٔ دنیا ہے یہ!؟
ڈھونڈتا تھا میں کبھی کس سمت ہے اسکا کراں — اور تکتا تھا کبھی سوئے فضائے آسماں!
پیرِ رومی، مرشدِ عالی نظر گویا ہوئے: — رُوبرو یہ عالم مریخ ہے، لے دیکھ اسے

اپنی دنیا کی طرح یہ ہے طلسمِ رنگ و بو
جس میں ہیں شہر و دیار آئینہ زارِ کاخ و کو

اس کے ساکن بھی ہیں مثلِ افرنگیوں کے فوق فنوں
جان و تن کے علم میں ہم سے کئی درجے فزوں

کیا زماں اور کیا مکاں دونوں پہ قاہر تر ہیں وہ
مادّی علمِ فضا میں چونکہ ماہر تر ہیں وہ

ایسے الجھے ہیں فضا کے گرد وہ عالی ہمم
دیکھ ڈالے ہیں انہوں نے اس کے سارے پیچ و خم

ساکنانِ خاک کا دل ہے اسیرِ آب و گل
اور اس دنیا میں سر تا سر بدن پابندِ دل!

کوئی انساں اپنے دل کو آب و گل میں گر بسائے
جس طرح بھی وہ ہو خواہاں ان کو ویسا ہی بنائے

حکمِ جاں ہی سے ہے ساری مستی و ذوق و سرور
حکمِ جاں ہی سے ہے حاصل جسم کو غیب و حضور

ہے دوتا دارِ جہاں میں تار و پودِ ہست و بود
جاں سراسر بے نمود اور تن ہے سر تا پا نمود!

جان و تن ہم خاکیوں کو جیسے طائر اور قفس
فکرِ مریخی خلاف اس کے یک اندیش اور بس!

جبکہ آجاتا ہے مریخی کے سر زورِ فراق
اور چسپت و چاق کرتا ہے اسے سوزِ فراق

یک دو دن پہلے ہی دیدیتا ہے مرنے کی خبر
برملا اعلان کر دیتا ہے سب پر پیشتر!

چونکہ جاں اعضائے جسمانی کی پروردہ نہیں
اس لئے اعصاب کی صحبت کی خوگردہ نہیں

اپنے اندر کھینچ لیتا تن کو ہے ان کی وفات
اس جہاں سے اپنے اندر کی طرف رم ہے ممات ۹۳۰

فہم سے تیرے ہے بالاتر مگر یہ ماجرا
کیونکہ تیری جاں ہے محکوم بدن سر تا بہ پا

آؤ تھوڑی دیر ہوں ہم اس جہاں سے آشنا
حضرتِ حق نے غنیمت ہے کہ یہ موقع دیا"

مریخی انجم شناس کی رصدگاہ سے باہر آمد

ایک بوڑھا جس کی داڑھی تھی سراسر مثلِ برف
علم اور حکمت پہ کی تھی جس نے ساری عمر صرف

تیز تھیں اس کی نگاہیں مثلِ دانایانِ غرب
پیر ہن اس کا مثالِ پیرِ ترسایانِ غرب

کہنہ سال، اونچا قد و قامت مثالِ نخلِ سرو
اور چہرہ تمتما تا صورتِ ترکانِ مرو!

نکتہ داں و آشنائے رسم و راہِ ہر طریق
آنکھ کی تابانیاں آئینۂ فکرِ عمیق!

روئے انساں دیکھ کر وہ صورتِ گل کھل اٹھا
اور زبانِ طوسی و خیام میں گویا ہوا:

اے خوشا وہ پیکرِ گل، وہ اسیرِ چند و چوں
بے محابا قیدِ تحت و فوق سے آیا بروں

خاک کو اہلیتِ پرواز بے طیارہ دی
ساکن و ثابت کو اس نے طاقتِ سیارہ دی"

نطق بھی ادراک بھی جولاں مثالِ آبجو!
گفتگوئے دلنشیں، (اللہ ھُو) (اللہ ھُو)! ۹۴۰

ہے سراسر یہ طلسم و خواب یا افسوں گری!
ہونٹ پر مریخیوں کے حرف ہائے فارسی!

پھر ہوا گویا کہ "دورانِ زمانِ مصطفےٰ"
ایک مریخی تھا خوش اخلاق مردِ باصفا

اس نے کی چشمِ جہاں بیں دا کمالِ شوق سے
تاکہ سیرِ جلوہ زارِ خطۂ انساں کرے

وہ فضائیں زندگی کی تہ بہ تہ دور و دراز
کھول کر پر اڑتے اڑتے آگیا سوئے حجاز

جو بھی دیکھا مشرق و مغرب میں وہ لکھتا گیا
نقشِ تحریر اس کا جنت سے بھی بڑھ کر خوشنما

میں نے بھی دیکھے ہیں مینو زارِ ایران و فرنگ
خلدِ نظارہ دیارِ نیل و سحر آباد گنگ

میں نے دیکھے ہیں سبھی امریکہ و جاپان و چین
گرم جولاں بہرِ تحقیقِ فلزاتِ زمیں!

تب سے ہوں میں بھی شب و روزِ زمیں سے باخبر
کر چکا ہوں اس کے سب بحر و بیاباں کا سفر

ہیں بنی آدم کے ہنگامے یہاں پیشِ نظر
گو ہمارے حال کی اس کو نہیں کوئی خبر"

رُومی

میں ہوں افلاکی، رفیقِ رہ مرا سیاحِ خاک
مست و سرخوش ہے مگر لب تشنۂ صہبائے پاک! ۹۵۰

ایک بے پروا جواں ہے نام اس کا زندہ رود
اس کی سرمستی کا ماخذ ہے تماشائے وجود!

ہم کہ ہیں دونوں چلے آئے تمہارے شہر میں
دہر سے آزاد ہیں گو ہیں بظاہر دہر میں!

ہیں تلاشِ جلوہ ہائے نو بہ نو میں گام زن
آ ہمارا ایک دو لمحے رفیقِ راہ بن!!!

حکیم مرغینانی

آیئے یہ ہیں نواحِ مرغینانِ برخیا
برخیا یعنی ابوالآبا ہماری قوم کا

فرزمرز اپنے یہاں کا آمرِ کردار زشت   برخیا کے پاس پہنچا تا بہ ایوانِ بہشت

اور کہا، "کیا ہے یہاں آسودہ رہنے میں مزا   مدتیں گذریں کہ تو محکوم یزداں ہی رہا!

تیری دنیا سے ہے بہتر ایک دنیا شاندار   جس کے آگے جنت الفردوس یک لمحہ بہار

اک جہاں جو سب جہانوں سے ہے بالاتر جہاں   لامکاں سے بھی کہیں پر کیف و اعلیٰ تر جہاں

خالقِ کون و مکاں بھی اس جہاں سے بے خبر   اس سے میرے علم میں کوئی نہیں آزاد تر!

ہستیٔ یزداں نہیں اس کے نظاموں میں دخیل   ہے کتاب اس میں نہ پیغمبر نہ پیکِ جبرئیل!

ہے طواف اس میں نہ سجدوں کا ہے کوئی التزام   ہے درود اس میں، دعا اس میں نہ ہے کوئی سلام

تھا جوابِ برخیا، "اے شعبدہ پرداز جا   نقش کا اپنے فسوں اس دیس ہی میں آزما"

برخیا نے جب نہ کھایا یوں فریبِ امتحاں   اس کے بدلے حق نے بخشا اور ہی ہم کو جہاں

آؤ یہ ملکِ خدا دادِ نگاریں دیکھ لو
مرغدین[1] اور اس کی ساری رسم و آئیں دیکھ لو"

۱- مرغدین - مریخ کا ایک شہر۔

شہرِ مرغدین کی سیر

مرغدین اور اس کی پُر شوکت عماراتِ بلند
کیا بتاؤں کیا تھا، کیسا تھا مقامِ ارجمند

بات کرتے ہیں حلاوت شہریوں کی عینِ نوش
خوبصورت، نرم خو اور صاف گو اور سادہ پوش!

فکرِ خود رو، زود رس ہے رنج و سوزِ اکتساب
رازدانِ کیمیائے تاب کارِ آفتاب!

جو بھی چاہے سیم و زر یوں نور سے حاصل کرے
جس طرح حاصل نمک کرتے ہیں آبِ شور سے!

تھی فقط خدمت ہی خدمت مقصدِ علم و ہنر
کارناموں کا صلہ دولت نہ مال و نقد و زر!

کوئی بھی اس جا نہ تھا آگاہِ دینار و درم
یہ حرم اور اس میں رہ پائیں یہ پتھر کے صنم!

فطرتِ انساں پہ مستولی نہیں دیو شیں
آسماں پہ کارخانوں کا دھواں طاری نہیں

رنج کش دہقان روشن ان کے ہاں گھر گھر دیئے
سب کے سب امین زمینداروں کے ترس و خوف سے

نہر کے جھگڑوں سے بے پروا سراسر کشت زار
اور زارع مالکِ مزروعہ ہے بے حصہ دار!

فوج و لشکر ہیں نہ یلغاریں نہ شورِ کارزار
اور نہ کشت و خوں کا پیشہ ہے سبیلِ روزگار!

شوخیٔ تحریر ہو یا سعیٔ تشہیرِ دروغ
اس جگہ پاتا نہیں کوئی قلم ان سے فروغ!

ہے نہ بازاروں میں بیکاروں کا طوفانِ خروش
یا فقیروں کی صدائیں ہیں کہیں آزارِ گوش!

حکیم مرخی

امتیازِ سائل و محروم یاں کوئی نہیں
عبد و مولا، حاکم و محکوم یاں کوئی نہیں!

زندہ رود

سائل و محروم ہیں تقدیرِ حق، منشائے حق
حاکم و محکوم ہیں تقدیرِ حق، منشائے حق!

کون ہے تقدیر کا خالق بجز ذاتِ خدا
چارۂ تقدیر ہو تدبیرِ انسانی سے کیا!

حکیم مرخی

ہو جگر خوں کن کوئی تقدیر اگر تیرے لئے
ذاتِ حق سے حکم تقدیرِ دگر کا مانگ لے ۹۸۰

ہے روا تو ہو اگر خواہاں نئی تقدیر کا
کیونکہ تقدیراتِ حق ہیں بے کراں، لا انتہا

خاکیوں نے کھو دیا سرمایۂ خود آگہی
اس لئے تقدیر کی گتھی نہ ان سے کھل سکی

مختصر ہے شرح اس کے نکتۂ باریک کی
تو اگر بدلے، بدل جائے تری تقدیر بھی!

تو اگر مٹی بنے نذرِ ہوا کر دے تجھے
اور پتھر ہو تو وہ شیشے پہ دے مار ے تجھے

ہے اگر شبنم تو گرنا حق سے ہے بہرہ ترا
بحرِ قلزم ہے تو ہے پائندگی حصہ ترا

ہر زماں خلاقِ صدہا بت خانۂ لات و منات
ان بتوں سے تو ہے جویائے ثباتِ اے بے ثبات؟

خود سے ناوابستگی جب تک ترا ایماں رہے
خود ترے افکار کی دنیا ترا زنداں رہے

رنج بے گنج اک تماشا ہے فقط تقدیر کا!
گنج بے رنج اک کرشمہ ہے فقط تقدیر کا!

گر حقیقت میں یہی ہے اصلِ دیں اے بے خبر!
جو ہے حاجت مند وہ ہو جائے گا محتاج تر!

دائے وہ دیں جو تجھے کرتا ہے مستِ کیفِ خواب
اور پھر سرمستیٔ خوابِ گراں میں غرقِ آب ۱۹۰

کیا کہا جائے اسے یہ سحر و افسوں ہے کہ دیں
کوئی بتلائے یہ کیا ہے؟ حب افیوں ہے کہ دیں

جانتا ہے قوتِ ادراک کا ماخذ ہے کیا؟
خاک کا کاشانہ کیونکر حور کا مسکن بنا؟

قوتِ فکرِ حکیماں کس سے ہے سرمایہ گیر
طاقتِ ذکرِ کلیماں کس کی ہے منت پذیر؟

ہے عطا کس کی یہ دل اور اسکی جملہ واردات
فیض جاری کس کا ہیں اس کے فنون اور معجزات؟

یہ جو تیری گرمیٔ گفتار ہے، تیری نہیں
یہ جو تیری مستیٔ کردار ہے تیری نہیں

یہ بہارستان فطرت کا سبھی فیضان ہے
اور فطرت خالقِ فطرت ہی کی اک شان ہے

زندگی کیا چیز ہے؟ کانِ زر و لعل و گہر
تو امیں اس کا ہے، مالک اور ہے اسکا مگر

حلاجؒ غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح جنہوں نے بہشت میں قیام پسند نہ کیا اور گردشِ پیہم کی دلدادہ رہیں

کیوں نہ صدقے جاؤں میں اپنے دلِ دیوانہ کے
بخشتا ہے جو مجھے ہر لمحہ دیرانے نئے ۱۰۵۱

میں کہیں رک جانا چاہوں تو وہ کہتا ہے یہی
مردِ خود آگاہ کو تو آبِ جو ہے بحر بھی!

چونکہ آیاتِ خداوندی ہیں بے حد و شمار
اے مسافر رہ ہے تیری راہ ناپیدا کنار

حاصلِ حکمت بصارت جس میں لازم ہے کمی
جوہرِ عرفاں بصیرت جس میں بیشی لازمی

تولنا اس کا ہے ممنونِ ترازوئے ہنر
اور اس کا جانچنا موقوف میزانِ نظر

اس کی کوشش کا نتیجہ کچھ نہیں جز آب و خاک
اس کی جد و جہد کا حاصل ہے لیکن جانِ پاک!

اس کی نظریں ہیں تجلی کی ہمیشہ گھات میں
یہ تجلی کو کرے تحلیل اپنی ذات میں

میں رہین جستجوئے جلوہ ہائے پے بہ پے
کرتا ہوں افلاک طے، نالہ کناں مانندِ نے

یہ فقط اس ہستیٔ فرخندہ کا فیضان ہے — جس کے سوزِ دل سے آتشناک میری جان ہے
ہم دو بینائے وجودِ افلاک پر گردش کناں — مشتری کے اک طرف اترا ہمارا کارواں
یہ جہاں کہیئے جیسے اک خاکدانِ ناتمام — چاند کتنے اس کے گرد اگرد سرگرمِ خرام
بادۂ گلگوں سے خالی اس کا بلوریں سبو — خاک سے اس کی نہ پھوٹا تھا نہالِ آرزو
نیم شب تابانیوں سے تھی ہماری نیم روز — تھی کوئی خنکی ہوا میں اور نہ کوئی تابِ سوز
آسماں کی سمت جب میں نے ذرا ڈالی نظر — اس کے سیارے کو پایا خود سے نزدیک اسقدر
ہوش برہم ہو گئے یوں ہیبتِ نظارہ سے — نزد و دور اور دیر و زود آپس میں گڈمڈ ہو گئے
اپنے آگے میں نے دیکھیں تین روحیں پاکباز — جن کے سینوں کی تب و تاب آتشِ گیتی گداز
زیبِ تن ہر ایک کے پوشاک ہائے لالہ گوں — تھا فروزاں چہروں سے ان کے عیاں سوزِ دروں
تھی ازل سے وہ امینِ تاب و تبِ آتش بجام — اپنے نغموں کی شرابِ تند سے مستِ دوام
بولے رومیؒ "آ اور ان روحوں سے ترسندہ نہ ہو — بلکہ ان آتش نواؤں کی نوا سے زندہ ہو!
شوقِ بے پروا نہ دیکھا ہو تو ان زندوں میں دیکھ — کیف اس مے کا نہ دیکھا ہو تو ان رندوں میں دیکھ
غالبؔ و حلاج اور ان کے ساتھ خاتونِ عجم — سب کے سب آتش منش شور افگنِ جانِ حرم

ان نواؤں کی بدولت روح کو حاصل ثبات
کار فرما ان میں تھا سوزِ درونِ کائنات!"

لوائے حلاّج

کہ اپنی خاک سے پیدا ہو آگ عنقا ہے
تجلی اور کہاں در خورِ تقاضا ہے

نظر ہے اپنے میں محو اسقدر کہ جلوۂ دوست
ہے چار سو، پہ کہاں فرصتِ تماشا ہے

ہے ملکِ جم سے فزوں یہ سخن نظیریؔ کا
جو ہو نہ قتل وہ ہم کیش کب ہمارا ہے

ہزار عقلِ فسوں پیشہ لشکر آراء ہو
غمیں نہ ہو کوئی جانبازِ عشق تنہا ہے

تو رہ شناس نہ اپنے مقام سے آگاہ:
ہے کوئی نغمہ جو بیرونِ سازِ سلمٰی ہے

جو کر نہ ہو تو شکارِ نہنگ کی کر بات:
نہ کہہ سفینہ مرا ناشناسِ دریا ہے

خوشا وہ مردِ اولوالعزم جو قدم نہ رکھے
نہ کوہ و دشت جہاں ہیں نہ کوئی دریا ہے

شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما ہو:
نہ مان اسکو جو نا آشنائے غوغا ہے۔

نوائے غالب

اٹھو کہ قاعدۂ آسماں بدل ڈالیں
قضا کا گردشِ رطلِ گراں سے منہ موڑیں

نہ محتسب کی کریں باز پرس کی پروا
جو آئے شاہ سے بھی ارمغاں تو رد کر دیں

کلیم بھی ہو اگر ہم زباں کریں نہ کلام
خلیل بھی ہو جو مہماں تو آشنا نہ بنیں

جو باج گیر ہوں شاہوں سے کو جنگ سے ہم
تہی کنار در گلستاں سے لوٹا دیں!

تمام صلح و صفا بن کے شاخساروں سے
طیورِ صبح کو پہنچا دیں آشیانوں میں!

عجب نہیں ہے جو ہم پیروانِ خیبر ہیں
کہ آفتاب کو مشرق کی سمت لوٹا دیں

نوائے طاہرہ

تجھ سے اگر ہو گفتگو چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رو
میں ترا غم بیاں کروں نکتہ بہ نکتہ مُو بمو

پھرتی ہوں صورتِ صبا میں تری دید کے لیے
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کُو بکُو!

تیرے فراق میں رواں آنکھوں کی راہ خونِ دل
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جُو بجُو!

جامۂ جاں میں اپنے یوں شوق کو تیرے بُن لیا
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پُو بہ پُو!
پایا نہ کچھ ترے سوا دل پہ بہت نگاہ کی
صفحہ بہ صفحہ تہ بہ تہ پردہ بہ پردہ تُو بہ تُو!

۱۰۹۰

یہ فسونِ سوز و سازِ عاشقانِ دردمند
سوزِ تازہ سے بھڑک اٹھا لیکا یک بند بند
مشکلاتِ کہنہ پھر قلب و جگر میں اٹھ پڑیں
فکر و اندیشہ پہ میرے پھر وہ شبخوں زن ہوئیں
قلزمِ اندیشہ تھا میرا سراپا اضطراب
شورشِ طوفانِ وحشت خیز سے ساحل خراب!
یہ کہا رومی نے وقت اپنا نہ کر تو گردِ رہ
تو اگر چاہے تو کھُل جائے تری اک اک گرہ
تا بکے افکارِ پنہانی کے زنداں میں اسیر
یہ قیامت غلغلہ افگن ہو بیرونِ ضمیر!

زندہ رود اپنے مسائل ان ارواح کے سامنے پیش کرتا ہے

آپ رہتے ہیں مقامِ مومناں سے دور کیوں؟
جلوہ زارِ جنت الفردوس سے مہجور کیوں؟

حلاج

جن کے دل آزاد ہوں اور رازدانِ غیب و زشت
ان کی روحیں ہوں اسیرِ چار دیوارِ بہشت!

جنت ملّا ہے سامانِ مے و حور و غلام
جنتِ آزادگاں ہنگامۂ سیرِ دوام!

جنت ملّا خورد و نوش و سکوں، خواب و سرود
جنتِ عاشق دل و جاں سے تماشائے وجود!

حشر ملّا ہے فقط شقِّ قبور و بانگِ صور
عشق شورش آفریں فی نفسہٖ صبحِ نشور!

علم کی بیم و رجا کے ہے ستونوں پر اساس
عشق کو امید کی پروا نہ کچھ خوف و ہراس

علم کو ترساں کرے رعبِ جلال کائنات
عشق مشتاقِ تماشائے جمالِ کائنات!

رفتہ و حاضر پہ نظریں علم کی شام و سحر
عشق کہتا ہے کہ دیکھے جاؤ جو آئے نظر!

علم کا پیمان وابستہ ہے جبر و ضبط سے
کوئی بھی چارہ نہیں اسکے لئے بجز صبر کے

عشق غیرت مند، آزاد اور آتش زیر پا
ہے تماشائے وجود اس کے لئے جرأت فزا

عشق آشفتہ دلوں کا شکوہ سے بیگانہ ہے
گرچہ وہ ذوقِ آشنائے گریۂ مستانہ ہے

کیا دلِ مجبور اپنا واقعی مجبور ہے؟
ناوکِ خونریز اپنا کیا نگاہِ حور ہے؟

آتشِ پنہاں کے شعلے اور بھڑکائے فراق
سازگار آئے ہماری جاں کو ایذائے فراق

بے خلش بے کرب جینا بھی کوئی جینا ہے کیا؟
ہے یہی جینا کہ جاں و دل ہوں آتش زیر پا!

اس طرح جینا حقیقت میں ہے تقدیرِ خودی — ہے اسی تقدیر سے سامانِ تعمیرِ خودی!! ۱۱۱۰
شوقِ بے حد کی تپش سے ذرہ بھی ہو رشکِ مہر — اس کے سینے میں سما جاتے ہیں نو کے نو سپہر!

شوقِ شوریدہ کسی عالم پہ جب یورش کرے
آئینوں کو جاودانی کرنے کی کوشش کرے

زندہ رود

گردشِ تقدیر کے مظہر ہیں مرگ و زندگی!
گردشِ تقدیر کے اسرار کیا جانے کوئی!

حلاج

جس کو یہ تقدیر کرتی ہے فراہم ساز و برگ — لرزہ بر اندام اس کے خوف سے ابلیس و مرگ!
جبرِ دینِ اہلِ ہمت، زندہ دل مردانِ حال — جبرِ مرداں ہے سراسر تاب و طاقت کا کمال
پختہ تر کرتا ہے جرأت مند انسانوں کو جبر — اور ہے خاموں کے حق میں حلقۂ آغوشِ قبر!
جبرِ خالد اک جہاں کو درہم و برہم کرے — اور ہمارا جبر ہم کو خستہ و بے دم کرے

شیوۂ مردانِ حق اندیش تسلیم و رضا — ناتوانوں کے ہے تن پر راست کب ان کی قبا

اے کہ تجھ پر آشکارا ہے مقامِ پیرِ روم — کیا نہیں معلوم تجھ کو یہ کلامِ پیرِ روم؟

"کہتے ہیں اک گبر تھا کوئی بہ عہدِ بایزید

ہم کلام اس سے ہوا یوں اک مسلمانِ سعید ۱۱۴۰

تو اگر ایمان لے آئے زہے قسمت تری

بالیقیں ہو گی تجھے حاصل نجات و سروری

یہ کہا اس نے اگر ایماں وہی ہے اے مرید!

جو ہے نورِ قلب و جانِ شیخ عالم بایزید

میں کہاں اور ایسے ایماں کی کہاں تاب و تواں

یہ فضیلت ہے ورائے جملہ کوششہائے جاں"

۱- بود گبرے در زمانِ بایزید

گفت او را یک مسلمانے سعید

خوشتر آں باشد کہ ایماں آوری

تا بدست آید نجات و سروری

حصۂ ما و شما ہے جز امید و بیم کیا؟ — سب کے امکاں میں نہیں اظہارِ تسلیم و رضا
اے کہ تو کہتا ہے جو تقدیر میں تھا ہو گیا — تھا جو کچھ آئینِ قدرت کا تقاضا ہو گیا
تو نے سمجھے ہی نہیں تقدیر کے معنی کبھی — تو نہ نورِ حق سے واقف ہے نہ آگاہ خودی
ہے گذارش بندۂ مومن کی پیشِ کبریا — ہم رضا چاہیں تری تو چاہ بندوں کی رضا!

عزم اس کا کرتا ہے تخلیق تقدیرِ خدا!
اس کا ناوک جنگ میں بن جاتا ہے تیرِ خدا!

زندہ رود

کم نگاہوں نے کیا برپا نہ کیا کیا شور و شر — بندۂ حق کو جہالت سے چڑھایا دار پر!

گذشتہ حاشیہ ۱ـ
گفت ایں ایماں اگر بست اے مرید
آں کہ دارد شیخ عالم بایزید
من نہ دارم طاقتِ آں تابِ آں
کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں

۱ـ: قرآن (۱۷ ـ ۸۵) قل الروح من امرِ ربی (کہہ دے اے روح میرے رب کا امر ہے)

اے کہ تجھ پر ہے ہویدا رازِ ہست و بود کا
کربیاں سرزد ہوئی تھی تجھ سے ایسی کیا خطا؟

حلاّج

میرے سینے میں تھی بانگِ صور کی شورش نہاں
میں نے دیکھی ساری ملت قبر کی جانب رواں!

کہنے کو مومن مگر با خو و بوئے کافری
لا الٰہ وردِ زباں، خود سے مگر ناآگہی!

کہتے تھے: ہے امرِ حق کیا نقشِ باطل کے سوا
کیونکہ آب و گل سے وابستہ ہے اس کا سلسلہ

میں نے روشن کی خود اپنے سینے میں نارِ حیات
اور بتائے مردہ انسانوں کو اسرارِ حیات!

یہ خودی ہے جس نے کی آراستہ بزمِ جہاں
دلبری اور قاہری موجود ہیں دونوں یہاں!

ہر کہیں پیدا ہے لیکن پھر بھی ہے پنہاں خودی
لا نہیں سکتی نگاہیں تاب اس کی دید کی!

نور ہے خلقت میں پھر بھی نار ہے اس میں نہاں
ہیں اسی کے طور سے سب جلوے زیرِ آسماں

ہر نفس ہر دل کہ ہے وابستۂ دیرِ کہن
وہ خودی کے بارے میں در پردہ ہے محوِ سخن

جو نہ اس کی تاب سے کسبِ تجلی کر سکے
آپ سے بیگانہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے

ہند اور ایران دونوں محرم اس کے نور سے
کون ہیں لیکن شناسا ہوں جو اسکی نار کے؟

میں نے سب کو اس کے نور و نار سے واقف کیا
بندۂ محرم یہی سرزد ہوئی مجھ سے خطا!

دیکھ ڈر جو کچھ کیا تھا میں نے تو نے بھی کیا
تو نے بھی ہے کر دیا مُردوں پہ اک محشر بپا

طاہرہ

ہائے کیا شے ہے گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازہ جس کا حاصلِ سوزِ دروں!

شوق بے اندازہ کر دیتا ہے پردے چاک چاک
تا کہ داغِ کہنگی سے دامنِ ہستی ہو پاک!

آخر کار اس کی قسمت میں وہی دار و رسن!
زندہ کوئے دوست سے واپس کب آئے خستہ تن

جلوے ہی جلوے ہیں اسکے دشت و در میں شہر میں
تا نہ ہو تجھ کو گماں باقی نہیں وہ دہر میں!

چھپ گیا اپنے ضمیرِ عصر کے اعماق میں
جانے وہ کیسے سمایا اس کے تنگ آفاق میں

زندہ رود

اے کہ قدرت سے ہے دردِ جستجو تجھ کو عطا
اک ذرا ارشاد ہو مطلب ترے اس شعر کا

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

غالب

نالۂ بے تاب جو سوزِ جگر سے سر ہوا
ہر کہیں ہیں اسکی تاثیر میں نظر آتی جدا

قمریاں تاثیر سے اس کی ہوئیں آتش بجاں
بلبلوں میں دھاریاں ہیں رنگ کی اسکا نشاں

اس کے اندر موت پیوستہ بآغوشِ حیات
جلوہ گر اک آن میں اک جا حیات اک جا ممات!

ایک ایسا رنگ جس سے شانِ بیرنگی عیاں
ایک ایسا رنگ جس میں وضع بے رنگی نہاں

یہ مقامِ رنگ و بو ہے یہ مقامِ رنگ و بو
بہرہ یاب اس سے ہر اک دل ہے بقدر آرزو

یا سراپا رنگ بن یا رنگ سے ہو جا جدا
تاکہ ہو تاثیر سے سوزِ جگر کی آشنا!!

زندہ رود

سو جہاں رکھتی ہے اپنے دل میں یہ نیلی فضا
ہوتے ہیں کیا ہر جہاں میں اولیاء و انبیا؟

غالب

دیکھ چشمِ غور سے یہ عالمِ بود و نبود
پے بہ پے دنیاؤں پر دنیائیں پاتی ہیں وجود
ہر کہیں جس جا بھی ہے ہنگامۂ عالم بپا
رحمۃ اللعالمیں بھی کوئی ہو گا رہ نما

زندہ رود

صاف تر فرمایئے ہے فہم میرا نارسا

غالب

یہ سخن وہ ہے کہ جس کو صاف کہنا ہے خطا

زندہ رود

کیا ہے ساری گفتگوئے اہلِ دل بے سود کیا؟

غالب

ہے بہت مشکل کہ یہ نکتہ لبوں تک ہو رسا ۱۶۰

زندہ رود

اے کہ ہے سوزِ طلب سے روح تیری آتشیں
جلئے حیرت ہے تجھے گفتار پر قدرت نہیں!

غالب

خلق، تقدیر اور ہدایت، تینوں ہیں آغاز کار
ان کا منشا رحمت اللعالمیں ہو آشکار

۱:- خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ہے۔ آیت قرآن (۸۷-۱) والذی قدر فھدیٰ

زندہ رود

روئے معنی ہے ابھی تک میری آنکھوں سے نہاں
پھونک دے ہم کو اگر ہے آگ سینے میں نہاں

غالب

اے کہ تو میری طرح ہے واقفِ اسرارِ شعر
یہ نوا ہے برتر از تابِ نوانِ تارِ شعر!
شاعروں نے گرچہ کی بزمِ سخن آراستہ
ان کلیموں کو یدِ بیضا سے ہے کیا واسطہ!

جس سخن کے مجھ سے تم جویا ہو وہ ہے کافری
کافری جو ہے سراسر ماورائے شاعری

حلاّج

جس جگہ تجھ کو نظر آئے جہانِ رنگ و بو
پھوٹتا ہو خاک سے جس کی نہالِ آرزو

مصطفٰے کے نور سے پاتا ہے وہ فروبہا
یا ابھی تک ہے وہ سرگرمِ تلاشِ مصطفٰے!

زندہ رود

پوچھتا ہوں آپ سے ہر چند ہے عینِ خطا
راز اس جوہر کا ہم کہتے ہیں جسکو مصطفٰے!
آدمی ہے وہ کہ جوہر کوئی مکنونِ وجود
گاہے گاہے جو ہے پاتا بزمِ ہستی میں نمود؟

حلاّج

یہ وہی ہے جس کے آگے خم ہے گیتی کی جبیں
عبدہٗ جس نے کہا ہے خود کو، وہ سدرہ نشیں
عبدہٗ تیرے لئے ہے ماورائے آگہی!
کیونکہ وہ آدم بھی ہے اور جوہرِ مستور بھی
جوہر اس کا اعجمی خلقت میں یا تازی نہیں
گرچہ آدم ہے مگر آدم سے ہے اقدم کہیں
عبدہٗ ہے وہ مگر صورت گرِ تقدیر بھی!
اس میں ویرانے بھی ہیں، تعمیر پہ تعمیر بھی!
جانفزا بھی، ساتھ ہی ہے جانستاں بھی عبدہٗ
یعنی شیریں بھی ہے اور سنگِ گراں بھی عبدہٗ
عبدہٗ اور عبد، یہ دونوں ہیں غیرِ یکدگر
ہم سراپا انتظار اور وہ ہمارا منتظر!
عبدہٗ ہے دہر اور ہے دہر نقشِ عبدہٗ
ہم سراپا رنگ ہیں اور عبدہٗ بے رنگ و بُو!

عبدہٗ با ابتدا ہوتے ہوئے لا انتہا!
وہ سراسر صبح و شام ماو تو سے ماورا!

عبدہٗ کے رازِ پوشیدہ سے کون آگاہ ہے
عبدہٗ کہتے ہیں جس سرِّ الا اللّٰہ ہے!

لا الٰہ تلوار ہے اور عبدہٗ ہے اسکی دھار
بلکہ ہے ھو عبدہٗ کہنا اسے شایانِ کار!"

عبدہٗ معمورۂ آفاق کا چند و چگوں:
عبدہٗ ہے کائناتِ دہر کا رازِ دروں!

کر نہیں سکتے ادا مفہوم اس کا چند بیت
اس کی شانِ کبریائی کی علامت مادیت

چھوڑ یہ سب رائیگاں گفت و شنود اے زندہ رود
غوطہ زن ہو جا بہ دریائے وجود اے زندہ رود

زندہ رود

میں نہ جانوں عشق کیا ہے اس کا کاروبار کیا
لذتِ دیدار اگر کہیئے تو ہے دیدار کیا؟

حلّاج

ذوقِ دیدارِ پیمبر، مرسلِ آخر زماں
حکم کو اس کے خود اپنی ذات پر کرنا رواں

ہم جییں دنیا میں مانندِ رسولِ انس و جاں
تاکہ ہو جائیں اسی کی طرح مقبولِ جہاں

اور پھر اپنے آپ کو دیکھیں، یہی دیدار ہے
کیونکہ اس سے دل کے اندر عکسِ ربّ دیکھا رہے!

زندہ رود

کیا ہے دیدارِ خدائے لایزال نہ سپہر
وہ کہ جس کے حکم سے گردش کناں ہیں ماہ و مہر؟

حلاج

نقشِ حق کی پہلے ڈالیں اپنے ہی دل میں طرح
پھر بہ جدّ و جہد اس کی دہر میں ڈالیں طرح

اس طرح یہ نقشِ حق بن جائے جب نقشِ تمام
خود بخود ہو جائے گا دیدارِ حق دیدارِ عام

کیا مبارک ہے وہ مومن جس کی اک مستانہ ہُو
کر دے ہفت افلاک کو آمادہ بہرِ طوفِ کو

حیف وہ درویش جس نے ہُو کا نعرہ سر کیا
سی لئے پھر ہونٹ اپنے اور چپ سادھے رہا!

حکمِ حق کو عام کرنے کی نہ جس نے سعی کی
اس نے نانِ جو تو کھایا دادِ کراری نہ دی

بھاگ کر خیبر سے اس نے خانقہ کی راہ لی
راہبی کی اختیار اور کجکلاہی چھوڑ دی!

نقشِ حق رکھے تو ہو سارا جہاں تیرا شکار
ہو تری تدبیر سے تقدیر یکسر ہمکنار

عصرِ حاضر مثلِ کافر تجھ سے سرگرمِ جدال
اُٹھ اور اُٹھ کر نقشِ حق کو اس کی لوحِ جاں پہ ڈال

زندہ رود

نقشِ حق کو اس جہاں پر کس طرح ڈالا گیا
واللہ اعلم یہ پیکر کس طرح ڈھالا گیا

حلاّج

یا بزورِ دلبری دنیا پہ یہ ڈالا گیا یا بزورِ قاہری اس کا یہاں چرچا ہوا
چونکہ حق ہے جلوہ پیرا دلبری میں بیشتر قاہری سے دلبری ہے لامحالہ معتبر

زندہ رود

تو کہ ہے مشرق کے اسرارِ نہاں سے آشنا
۱۲۰۴ زاہدوں اور عاشقوں کے درمیاں ہے فرق کیا؟

حلّاجؔ

زاہدِ کامل ہے اپنے ہی جہاں میں اجنبی
عاشقِ صادق ہے فردوسِ جناں میں اجنبی

زندہ رود

معرفت کی انتہا ہے نیستی، نابودگی؟
زندگی کیا در حقیقت ہے فنا آسودگی؟

حلّاجؔ

ایسی ہستی در حقیقت ہے تہی پیمانگی
تو فنا میں ڈھونڈتا ہے گوہرِ مقصود کو؟

یہ سراسر مستیٔ عرفاں سے ہے بیگانگی
پا نہیں سکتا عدم ہرگز کبھی موجود کو!

زندہ رود

جس کا دعویٰ تھا کہ آدم پہ ہے اسکو برتری
ہے خم و ساغر میں اسکے مے نہ تلچھٹ ہی رہی

مشتِ خاک اپنی ہوئی ہے سرفرازِ آسماں
آگ اس بیچارے کی لیکن گئی جانے کہاں

حلاج

کچھ نہ پوچھ اے وائے حالِ خواجۂ اہلِ فراق
وہ کہ ہے روزِ ازل سے تشنہ لب خونیں ایاق!

ہم جہول اور ذات اسکی عارفِ بود و نبود
کفر سے اسکی ہوئی اس راز کی ہم پر کشود!

یہ کہ ہوتی گرنے سے ہے اٹھنے کی لذت سوا
گھٹنے کے غم پہ خوشی بڑھنے کی ہے کیا جانفزا!

عشق کیا ہے مستقل جلنا کسی کی آگ میں
خاک جلنا ہے نہ جبتک اسکے شعلوں میں جلیں!

عشق اور خدمت میں تھا از بسکہ سب سے پیشتر
حضرت النساں کو کیا اسکی حقیقت کی خبر

چاک کردے چاک تو پیراہنِ تقلید کو
تاکہ تو اس سے سمجھ لے معنیٔ توحید کو

زندہ رود

اے کہ ہے اقلیمِ جان و دل ترے زیرِ نگیں
رہ یہاں دو چار لمحے اور بھی تو ہم نشیں

حلّاج

ہم کہاں اور ایک ہی جا پر قیامِ دائمی
ہم کہ ہے پرواز ہی پرواز اپنی زندگی
ذوقِ جلوہ سے ہیں سرگرمِ تپش ہم صبح و شام
ایک پروازِ مسلسل بے پر و بال اپنا کام!

خواجۂ اہلِ فراق کی نمود

صحبتِ روشن دلاں کا عرصہ ہے دو ایک دم
اور یہ اک دو دم ہی ہیں سرمایۂ بود و عدم
عشق کو دہ زندہ دل شوریدہ تر کر کے گیا
عقل کو صاحب نظر بینندہ تر کر کے گیا!
بند کر لیں میں نے آنکھیں تا رہے وہ میرے ساتھ
آنکھ سے لا کر بساؤں دل میں وہ جانِ حیات

ناگہاں دیکھا کہ یہ سارا جہاں تاریک ہے — ہر جزو کل از مکاں تا لامکاں تاریک ہے

اس شبِ تاریک میں اک شعلہ پیدا ہو گیا — جس سے اک پیرِ کہن پیکر ہویدا ہو گیا

اک قبائے سرمئی سے تن بدن ڈھانپا ہوا — سر سے پا تک پیچ و خم کھاتا دھواں لپٹا ہوا

بولے رومی "دیکھو یہ ہے خواجۂ اہلِ فراق

یہ سراپا سوز، یہ شعلہ منش خونیں ایاق!

کم سخن اس درجہ اور کم خندہ پیرِ کہنہ سال — تن میں جاں کو دیکھ لیتی ہے نظر جادو مثال

رند بھی، ملا بھی، دانا بھی یہ پیرِ خرقہ پوش — اور عمل میں بھی مثالِ زاہداں ہے سخت کوش

اس کی خلوت سر بسر ہنگامۂ ذوقِ وصال — زہد ہے اس کا یہی ترکِ جمالِ لایزال!!

حق سے از بسکہ جدا ہونا بہت دشوار تھا — ترکِ سجدہ کر کے اس مشکل کو آساں کر دیا!

دیکھ تو چشمِ حقیقت بیں سے اس کی واردات — یہ ہجومِ مشکلات اور پھر بھی یہ شانِ ثبات!

مبتلائے رزمِ خیر و شر برابر آج تک!

سینکڑوں دیکھے پیمبر، اس پہ کافر آج تک!"

دل تڑپ اٹھا مرا اس تفتہ جاں کے سوز سے — آہِ غم آلود نکلی لب سے اس ناشاد کے

مجھ کو چشمِ نیم وا سے دیکھ کر اس نے کہا — "مجھ سے بڑھ کر ہے عمل کا کون دلدادہ رہا؟

یہ رہی مصروفِ کاروبار میری زندگی — جمعہ کے دن کی فراغت بھی نہ حاصل ہو سکی

کیا فرشتہ اور کیا کرہ کی مدد مجھ کو ملی — وحی بھی آئی تو وہ بے منتِ پیغمبری

ساتھ لایا ہوں حدیثیں ہیں نہ الہامی کتاب
پھر بھی کیا کیا ڈھائے ہیں جاں پر فقیہوں کی عذاب

رشتۂ دیں کو فقیہوں نے بٹا جیسے نہ پوچھ
کعبہ کا شیرازہ برہم کر دیا کیسے نہ پوچھ

میرے مذہب کی مگر بنیاد کچھ ایسی نہیں
یہ وہ مذہب ہے کہ جس میں کوئی فرقہ ہی نہیں

کر دیا میں نے سجودِ حق کو ترک اے بے خبر
اور کیا ہے ساز کیا ارغنونِ خیر و شر

مت سمجھ مجھ کو ہے انکارِ وجودِ کبریا
دیکھ تو باطن مرا اطوارِ ظاہر پہ نہ جا

گر کروں انکارِ حق، یہ ہے سراسر ابلہی
دیکھنے کے بعد لا کہنا دلیلِ گمرہی!

پردۂ انکار میں میرے چھپا اقرار ہے
گفتہ سے سو درجہ بہتر آن کہی گفتار ہے

جب سے مجھ کو دردِ آدم کا کیا ہے حصہ دار
رہنے کب باقی دیا ہے اس کے سر پہ قہرِ یار؟ ۴۰

بن گئی آتشکدے شعلوں سے میری کشت زار
پھر سے انساں جا پہنچا بہ اوجِ اختیار

آ چھڑا دے میرا دامن میری اپنی آگ سے
آدم اگر میری پیچیدہ گرہ کو کھول دے

اے کہ تو ہے حلقہ ہائے دام میں میرے پھنسا
اور شیطاں کو اجازت کی ہے عصیاں کی عطا

اس جہانِ زیست میں با ہمتِ مردانہ جی
اے مرے ہمدرد مجھ سے رہ کے تو بیگانہ جی!

میرے نیش و نوش دونوں ہی سے بے پروا گزر
تا نہ میرا نامۂ اعمال ہو تاریک تر!!

ہیں یہاں صیاد ہی صیاد جب نخچیر ہیں
تو سلامت ہے تو ترکش میں ہزاروں تیر ہیں

صاحبِ پرواز کو افتاد کا خطرہ کہاں
صید زیرک ہو تو صیادوں کی کوشش رائیگاں"

چھوڑ دے" میں نے کہا "یہ رسم و آئینِ فراق
جانتا ہے "ابغض الاشیاء عندی الطلاق"[1]

بول اٹھا ہے "اصل سازِ زندگی سوزِ فراق
ہے مبارک سرخوشی و مستیٔ روزِ فراق!

لب مرے نا آشنائے گفتگوئے وصل ہیں
وصل اگر چاہوں تو وہ باقی رہے یارو نہ میں!

وصل کا ذکر آتے ہی وہ خود سے بیگانہ ہوا
دل میں سوز و درد سے پھر کرب تازہ ہو گیا

اک ذرا اپنے دھوئیں میں پیچ کھائے دائیں بائیں
اور پھر گم ہو گیا اپنے دھوئیں کی اوٹ میں!

دودِ پیچا پیچ سے اک نالۂ محزوں اٹھا
کیا مبارک ہے وہ جاں جو کرب سے ہو آشنا

نالۂ ابلیس

ذاتِ بے ہمتا خداوندِ صواب و ناصواب
صحبتِ آدم نے مجھ کو کر دیا خوار و خراب

یہ کبھی احکام سے میرے ابا کرتا نہیں!
خود کو کھو کر خود کا پھر کوئی پتا کرتا نہیں

لذتِ احکام سے دل سر بسر بیگانہ ہے
وہ شرارِ کبریا سے کسقدر بیگانہ ہے!

صید خود کہتا ہے آؤ آؤ صیادو اِدھر
اس قدر فرماں پذیری الامان و الحذر!

مجھ کو اس صیدِ زبوں سے اے خدا آزاد کر
تیرے قرباں! طاعتِ دیروزہ میری یاد کر

پست اس صیدِ زبوں سے ہمتِ والا مری!
وائے یارب زندگیٔ تلخ و دردافزا مری

---

۱ - الطلاق - حدیث شریف - میرے نزدیک طلاق سب سے ناپسندیدہ چیز ہے -

فطرت اس کی خام، اس کا عزم بھی اتنا غریب
تاب لا سکتا نہیں اک ضرب کی ایسا حریف

ہے مجھے درکار ایسا بندۂ صاحب نظر
جو ہو صدرہ اس حریفِ ناتواں سے پختہ تر

لے لے واپس یہ کھلونا خام مٹی کا حقیر
کھیل کس منہ سے کوئی بچوں کا کھیلے مردِ پیر!

ابنِ آدم کیا ہے، کچھ بھی تو نہیں جز مشتِ خس
اس خس و خاشاک کو صرف ایک چنگاری ہے بس

اس جہاں میں گر بجز خاشاک کوئی شے نہ تھی
مجھ کو اتنی آگ دینے کی ضرورت ہی نہ تھی!!

شیشۂ نازک کو پگھلانا تو ادنیٰ بات ہے
گر کوئی پتھر کو پگھلا دے تو پھر کیا بات ہے!

اِن فتوحاتِ فرومایہ سے دل تنگ آگیا
ہاں تلافی ذاتِ حق اے مرجعِ عدل و جزا!!

چاہتا ہوں میں کہیں مل جائے انکاری کوئی
ایسے مردِ حق کی جانب کر دے میری رہبری

میری گردن توڑ ڈالے پہلواں ایسا ملے
جسم لرزاں ہو مرا جس کی نگاہِ قہر سے!!

جو یہ کہدے دُور ہٹ میری نگاہوں سے ہو دُور
مول میرا ایک کوڑی بھی نہ ہو جس کے حضور

ہو مقابل میرا کوئی ایسا مردِ حق پرست
باعثِ لذت ہو جس کے ہاتھ سے میری شکست

فلکِ زحل

وہ ذلیل روحیں جنہوں نے ملک و ملت سے غداری کی اور دوزخ نے بھی انہیں قبول نہ کیا

مرشدِ رومی جلال الدیں، امامِ صدق و حق
پیرِ دانا آشنائے ہر مقامِ صدق و حق

آپ نے فرمایا "اے گردوں نورد سخت کوش
دیکھتا ہے سامنے وہ عالمِ زنار پوش؟

اس نے گرد اپنی کمر کے ہے جو لپٹا رکھی شے
وہ کسی سیارے کی دم سے چرا کر باندھی ہے

اسقدر بوجھل کہ چلنے میں حرام اس کا سکوں
جو بھلائی بھی ہو اس کے حکم سے زشت و زبوں!

آب و گل ہی سے بنا یہ پیکرِ سیارہ بھی
ہے مگر اس پر قدم رکھنے میں دشواری بڑی

برق کے کوڑے لئے لاکھوں فرشتے چیرہ دست
قاسمِ قہرِ خدا ہیں اس میں از روزِ الست!

مارتے جاتے ہیں دَرّے پیہم اس سیارے کو
اس کے محور سے ہٹائے دیتے ہیں بیچارے کو!

ایک عالم ہے کہ ہے مردود و مطرودِ سپہر!
شام کے مانند ہے اس کی سحر بے نورِ مہر!

یہ ہے ان روحوں کی منزل جو ہیں بے یومِ نشور
ان کے جسموں کو جلانے سے جہنم بھی نفور!

اس کے اندر ہیں فروکش دو ہی طاغوتِ کہن
کشتہ ساری قوم کی روحِ رواں بہرِ دو تن!

جعفر و صادق زبوں کارانِ بنگال و دکن!
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن، ننگِ زمن

دونوں یکساں ناقبول و نا امید و نامراد
ایک ملت ان کے باعث نذرِ آشوب و فساد

ایسی ملت جس نے ہر ملت کے بندھن وا کئے
ملک دیں اس کے مقامِ عز و شاں سے گر گئے

کیا نہیں تجھ کو خبر یہ خطۂ ہندوستاں
خطۂ زرّیں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں

ایسا خطہ جس کا ہر اک ذرہ ہے گیتی فروز
آج تک غلطاں ہے خاک و خوں میں پست و تیرہ روز

کون اسکی خاک میں تخمِ غلامی بو گیا؟
یہ انہی زشت و زبوں ارواح کا کردار تھا

اس فضائے نیلگوں میں دیکھ اک پل ٹھہر کر
ہے مکافاتِ عمل کیا عبرتِ نوعِ بشر"

قلزمِ خونیں

جو نظر آیا مجھے اس کی نہیں تاب بیاں
اس قدر وحشت رہا باقی نہ تن میں ہوشِ جاں

دیکھتا ہوں اک سمندر خون کا دہشت فگن
اس کے باہر اس کے اندر تند طوفاں موج زن

ناگ ہی ناگ اس کے اندر جیسے قلزم میں نہنگ
کالے کالے انکے پھن اور بال و پر سیماب رنگ

موجیں ہی موجیں کہ تھیں خونخوار مانند پلنگ
جاں بلب تھے ان کی ہیبت سے لبِ ساحل نہنگ

تھی سمندر سے نہ اک لحظہ بھی ساحل کو اماں
کوہ کے تودے کے تودے خوں میں گرتے ہر زماں

کیسی کیسی کشمکش امواجِ خوں کے درمیاں
ایک کشتی ان کے اندر لے رہی تھی ڈبکیاں

اور اس کشتی میں تھے دو آدمی ہی زرد رو
زشت صورت، خشک لب، مکروہ تن، آشفتہ مو

رُوحِ ہندوستاں کی نمود

آسماں شق ہو گیا اور اک حورِ پاک جاں
پردہ چہرے سے ہٹا کر ہو گئی جلوہ فشاں

تھے جبینِ ضوفشاں میں نار و نورِ لایزال
دونوں آنکھوں میں نمایاں تھا سرورِ لایزال

اک ردائے نور زیبِ تن، سبک مثلِ سحاب
تار و پودِ نقرئی گویا رگِ برگِ گلاب!!

اتنی رعنائی پہ بھی قسمت میں اس کی قید و بند
اور ہونٹوں پر مسلسل نالہ ہائے دردمند

رومی نے فرمایا "رُوحِ ھند دیکھ اے دیدہ ور
اس کے نالوں سے سراپا سوز ہے قلب و جگر"

رُوحِ ہند کا نالہ و شیون

بجھ چکی ہے شمعِ جاں، افسردہ ہے فانوسِ ہند
اہلِ ہندستاں ہیں خود بیگانۂ ناموسِ ہند

ہیچ ہے انساں جو ہو اپنی خودی سے بے خبر
وہ کہاں مضراب زن ہوتا ہے اپنے ساز پر

روح کو اپنی رجھاتا ہے زمانِ رفتہ سے
دل کو گرماتا ہے یعنی آتشِ افسردہ سے

ہیں اسی سے دست و پا پر میرے اتنی بیڑیاں
ہیں اسی سے نارسا نالے بھی اور آہ و فغاں

خود کو بھولا پیکرِ ہستی کو بے جاں کر دیا
رسم و راہِ کہنہ سے تعمیر زنداں کر دیا

اس کی ہستی سے تمام انسانیت اندوہ مند
پاک و ناپاک اس کا عصرِ نو کو سامانِ گزند!

چھوڑ ایسا فقر جو مائل بہ عریانی کرے
مرحبا وہ فقر جو تدبیرِ سلطانی کرے!

الحذر دونوں سے چاہے جبر ہو یا خوئے صبر
جابر و مجبور دونوں کیلئے ہے زہر جبر!

بندۂ مجبور پیہم صبر کا خوگر بنے
اور جابر بھی مسلسل جبر کا خوگر بنے!

دونوں کا ذوقِ ستم، ذوقِ جنوں بڑھتا رہے
وردِ یا من لیت قومی یعلمون[1] بڑھتا رہے

ہائے کب ہوگی سحر یہ رات ہندستان کی
مر چکا جعفر اور اس کی روح ہے زندہ ابھی ۱۳۱۰

جو نہی پالیتی رہائی ہے کسی بندھن سے یہ!
جوڑ کر لیتی ہے پیدا اور ہی بندھن سے یہ

گاہ ارباب کلیسا سے کرے وہ سازباز!
اور اہلِ دیر سے ہو گاہ سرگرمِ نیاز!

دین بھی آئین بھی اس کا فقط سوداگری
ہے لباسِ حیدری میں کارِ فرما عنتری

جیسے جیسے یہ جہانِ رنگ و بو بدلے نظام
ویسے ویسے اس کے آئیں کا بھی بدلے اہتمام

اس سے پہلے اور ہی اس روح کا معبود تھا
اب وطن معبود ہے، یہ عہدِ نو کا دیوتا!!

۱- کاش میری قوم حقیقتِ حال سے آگاہ ہوتی۔

ہے بظاہر یہ غمِ دیں سے نزار اور دردمند
اور باطن میں مثالِ دیر یاں زنار بند!

جو بھی جعفر کا بدن ہو اس کا فن ملّت کشی
ایسے مسلم کا ہے دیرینہ چلن ملّت کشی

سب سے ہنستا کھیلتا ہے لیکن ہے کس سے اسکو پیار
مار اگر خنداں بھی ہو جائے تو وہ پھر بھی ہے مار

تفرقوں سے وحدتِ ملت کو صد پارہ کرے
موردِ الزام ساری قوم اس کی ذات سے

ہر کہیں ملّت ہو جب غارت گروں سے آشنا!
جعفر و صادق ہی سے ملتا ہے اس کا سلسلہ ۱۳۲۰

روحِ جعفر سے خدایا الحفیظ والامان!
جعفروں سے اس زمانے کے فغان و صد فغان!

قلزمِ خونیں کے ایک کشتی نشیں کی فریاد

ہم نہ مقبولِ عدم ہیں اور نہ مقبولِ وجود!
ہائے یہ کرب آفریں بے مہریٔ بود و نبود!

جونہی آئے اس جہانِ شبشہت سے تا عدم
فرطِ درد و کرب سے پہنچے درِ دوزخ پہ ہم

ایک چنگاری بھی ڈالی جعفر و صادق کے سر؟
ایک مٹھی راکھ بھی پھینکی ہمارے فرق پر!

بولا دوزخ کے لئے بہتر خس و خاشاک ہی
خوب ہے ان سے رہے گر میرا شعلہ پاک ہی

پہنچے چلتے چلتے دونوں آں سوئے نہ آسماں
گرتے پڑتے آن پہنچے پیشِ مرگِ ناگہاں!

بولی وہ رازوں میں میرے رازِ پنہاں جاں بھی ہے
کام میرا حفظِ جاں بھی ہے فنائے جاں بھی ہے

کیا ہے جانِ زشت؟ بالکل ہیچ و پوچ و رائیگاں
چل پرے ہٹ تو کہ مجھ سے چاہتا ہے کسرِ جاں

مجھ سے ایسی حرکتِ بیہودہ ہو سکتی نہیں

مجھ سے ایسی حرکتِ بیہودہ ہو سکتی نہیں

اے ہوائے تند و تیز! اے موجزن دریائے خون!
اے زمینِ تیرہ فام! اے آسمانِ نیلگوں!

اے نجومِ تابدار! اے ماہتاب! اے آفتاب!
اے قلم! اے لوحِ محفوظ اور اے ام الکتاب!

اے بتانِ ابیضِ افرنگ! اے سردارانِ غرب
اک جہاں زیرِ بغل جن کے بغیر حرب و ضرب!

گرچہ ہے بے ابتدا، بے انتہا اپنا جہاں!
لیکن اس میں بندۂ غدارہ کا مولا کہاں؟

ناگہاں آئی صدا اک دہشت آگیں ہولناک
ہو گیا بحر اور بر کا جس سے سینہ چاک چاک!

ربطِ اجزائے بدن کا پارہ پارہ ہو گیا!
دمبدم بدم تو دوں پہ تودا کوہساروں کا گرا!

بادلوں کی طرح اڑتے جا رہے تھے کوہسار!
بے صدائے صورِ محشر انہدامِ روزگار!

بڑھ گئی اس درجہ برق و رعد کی تابِ دروں
ڈھونڈی ان دونوں نے گھبرا کر پناہِ بحرِ خوں!

پھر بھی موجیں اور بھی پُرشور تھیں اور بیقرار
غرقۂ خوں ہو گئے کوہ و کمر بے اختیار!

جو بھی گذری ظاہر و پوشیدہ ہر اک چیز پر
گذرے بے پروائی سے تاروں کے لشکر دیکھ کر

آں سوئے افلاک

جرمن فلسفی نطشہ کا مقام

ہر کہیں دست و گریباں بود ہے نابود سے
راز کیا جانے کوئی اس چرخِ نیلی فام کے!

ہر کہیں لاتا ہے پیکِ مرگ پیغامِ حیات
داد کے قابل ہے وہ جو جان لے رازِ حیات

ہر کہیں ہے دہر میں مانند بادِ رزاں حیات
بے ثبات و بے بقا دل میں تمنائے ثبات

میں نے دیکھے سینکڑوں شش روزہ عالم بار بار
پھر کہیں جا کر ہوئی آفاق کی حد آشکار!

جو جہاں ہے اس کا مہر و ماہ و پرویں ہے جدا
زندگی کا رنگ و ڈھنگ و رسم و آئیں ہے جدا

ہر جہاں میں اور دورانِ زماں کا سلسلہ
اک جگہ آہستہ رو اور دوسرے میں برق پا!

سال ہے اپنا اِدھر اک مہ اُدھر صرف ایک دم
بیش اس آفاق کا ہے دوسری دنیا میں کم!

یہ ہماری عقل دنیا میں بلا کی ذوفنوں!
اور دنیاؤں میں ہے بے وقعت اور خوار و زبوں!

اس جہانِ چند و چوں کی سرحدوں پر ایک جا
ایک انساں تھا، صدائے کرب جس کی جانگزا!

تھیں عقابوں سے بھی آنکھیں تیز تر، بیندہ تر!
اور چہرہ آئینہ دارِ تب و تابِ جگر!

دمبدم سوزِ دروں اٹھتا ہوا، بڑھتا ہوا
اور یہ شعرِ وجد آور زیرِ لب پڑھتا ہوا

جبریل نہ فردوسی نہ حور اور نہ خدا ہے
وہ خاکِ تمنا کا عجب سوزِ ملا[1] ہے!

میں نے رومی سے یہ پوچھا کون یہ دیوانہ ہے؟
یہ حکیم المانوی فرزانوں کا فرزانہ ہے!

زیر و بالا عالموں کے درمیاں ہے اسکی جا
نغمۂ دیرینہ سے معمور ہے اس کی نوا!

یہ ہے اپنے دور کا حلاج بے دار و رسن
جس نے دہرایا نئے انداز سے حرفِ کہن

بے محابا گفتگو، افکار ہیں اسکے عظیم
اہلِ مغرب اسکی شمشیر برہنہ سے دو نیم

ہم نشینوں نے نہ سمجھا اُسکا جذبہ اسکا جوش
بندۂ مجذوب کو سمجھے ورائے عقل و ہوش

حیف عاقل عشق کی سرمستیوں سے بے نصیب
مشوروں سے ان کے اس کی جاں رہی تدبیرِ طبیب

پاس کیا ہے ان طبیبوں کے سوائے ریو و رنگ
ہائے وہ مجذوب جو ہو زادۂ ملکِ فرنگ!

ابنِ سینا کو بیاضِ علم و حکمت آئے راس
فصد کھولے، سببِ خواب آور سے سن کرے دوا اس

یہ بھی اک حلاج تھا اپنے وطن ہی میں غریب!
جان ملا سے بچی تو کھا گیا اس کو طبیب!

۱۳۶۰

بسکہ مرد راہ داں افرنگ میں کوئی نہ تھا
اس کا نغمہ چنگ کے تاروں سے افزوں ہو گیا

کون رہروِ کو بتاتا راہِ منزل کا پتہ!
واردات اس کے ہوئے سو سو خلل میں مبتلا

---

۱ - نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزومندے

زر تو تھا لیکن نہ کرنے والا تھا کوئی عیار
کارواں کوئی نہ تھا اس کو بتاتا مردِ کار!

ایک عاشق تھا خود اپنی آہ میں کھویا ہوا!
ایک سالک حیف اپنی راہ میں کھویا ہوا!

اس کی وحشت سے ہوا ہر ایک شیشہ چور چور
وہ خدا سے بھی گیا اور ہو گیا خود سے بھی دور!

اس نے چاہا بر ملا دیکھے بچشمِ ظاہری
قاہری اور دلبری کا اختلاطِ باہمی!

یہ تمنا تھی ہو آب و گِل کی تہہ سے آشکار
کشتِ دل سے جو اُگا کرتا ہے خوشہ زر نگار

جس کا وہ جویا تھا وہ اوجِ مقامِ کبریا!
دسترس سے عقل و حکمت کی سراسر ماورا

زندگی کیا ہے؟ فقط شرحِ اشاراتِ خودی
لا اور الّا منفی و مثبت مقاماتِ خودی

لا ہی میں کھویا رہا تا اوجِ اِلّا نارسا!
وہ مقامِ عبدہٗ سے رہ گیا نا آشنا!

غرقۂ موجِ تجلی پھر بھی اس سے بے خبر!
جس طرح بیخِ شجر سے دُور ہو اس کا ثمر!

کچھ سوائے رویتِ آدم اسے سودا نہ تھا
"ہے کہاں انساں؟" فقط یہ نعرۂ مستانہ تھا

کیونکہ وہ بیزار تھا ان پیکرانِ خاک سے
مثلِ موسیٰ دیدہ و دل طالبِ دیدار تھے!

کاش احمد کے زمانے میں وہ پاتا زندگی
ہاتھ آجاتا اسے کیف و سرورِ سرمدی!

عقل محوِ گفتگو تھی اس کی خود سے سر بسر
تو رواں ہو اپنی رہ پر جو ہے سب سے خوب تر

ہاں قدم آگے بڑھا لے آگیا ہے وہ مقام
جس میں ہو بے منتِ الفاظ خود پیدا کلام

جنتِ الفردوس میں نقل و حرکت

پار کر کے اس جہانِ شش جہت کی انتہا
میں جہانِ بے جہت میں گرمِ جولاں ہو گیا

اس جہاں میں دائیں بائیں کا نہ تھا نام و نشاں
روز و شب سے بے خبر، بیگانۂ دورِ زماں!

اس کے آگے میری قندیلِ خرد گل ہو گئی
ہیبتِ معنی سے ساقط طاقتِ گفتار بھی!

اس زبانِ آب و گل کے ساتھ کیا گفتارِ جاں

۱۳۸۰

کوششِ پرواز اور کنجِ قفس میں الاماں

اک ذرا اپنے جہانِ دل پہ تو ڈال اک نظر!
تا کہ ہو اپنی خودی کے نور سے روشن بصر!

کیا ہے دل؟ دنیائے ناپیدا کراں، بے رنگ و بو!
عالمِ بے رنگ و بو اَن تھاہ اور بے چارسو!

دل کہ ساکن ہے بظاہر ہر نفس سیار ہے!
عالمِ احوال ہے یہ عالمِ افکار ہے!

ہے حقائق سے حقائق تک خرد کا ارتقا
سیر اس کی بے رہ و بے جنبش و بے نقلِ جا

عقل کے صدہا خیال اک دوسرے سے سب جدا!
کوئی تا گردوں رسا ہے اور کوئی نارسا!

آسماں پیما ہوا کوئی خیال ان میں تو کیا
ساتھ ساتھ اس کے رہا کوئی خیالِ نارسا

کب ہوا سرشار کوئی جلوۂ دیدار سے
یا سرورِ آگیں ہوائے کوچۂ دلدار سے

چشمِ تیری وا ہو یا آسودۂ دنیائے خواب
دل ہمیشہ دیکھتا ہے بے شعاعِ آفتاب

اس جہاں کا ہو جہانِ دل سے اصلیت شناس
کیا بتاؤں تجھ کو میں یہ نکتۂ فوق القیاس!

یہ وہ عالم ہے نہاں ہے اور ہی جس میں جہاں
اور ماہیت ہے جس کی اور جس کا کن فکاں!

لازوال اور ہر زماں نوعِ دگر، طورِ دگر!
وہم میں آتا نہیں گو بر ملا آئے نظر!

ہر نفس اس سے عیاں ہے اک نئی شانِ کمال
لمحہ لمحہ، دم بدم، اک طرفہ نیرنگ خیال!

رات دن اس کے نہیں منت پذیرِ ماہ و مہر
اسکی پہنائی میں کھو جا سکتے ہیں ساتوں سپہر!

جو بھی بطنِ غیب میں پنہاں ہے آئے رُو برو!
پیشتر اس سے کہ نکلے لب سے حرفِ آرزو!

اسکی کیفیت کرے تو کیا بیاں اپنی زباں!
سر بسر نور و حضور اور زندگی سے پُر جہاں

نالے ہی لالے ہیں جو آسودہ کہسار و نمیں ہیں
نہریں ہی نہریں خراماں اسکے گلزار و نمیں ہیں

پنجے ہی غنچے لہکتے، سرخ، نیلے، چمپئی
پھوٹتی ہے قدسیوں کی سانس سے ہر ہر کلی

اس کا پانی نقرئی اسکی ہوائیں عنبریں
قصر اُجلے اُجلے، گنبد ان کے اوپر زمردیں!

نا میسا نے لعل گوں زر تار ان کی ہر طناب
سیم تن شاہد جبینیں، جن کی ہیں آئینہ تاب!

رے رومی سن مری بات اے گرفتارِ قیاس
اپنے دامن سے جھٹک دے اعتباراتِ حواس

ہے تجلی پر مدارِ کارہائے خوب و زشت
کوئی ہو دوزخ سراپا کوئی سرتاپا بہشت!

جو آتے ہیں نظر الوانِ ہائے رنگ رنگ
اصل ہے حسنِ عمل ان کی بجائے خشت و سنگ

ن کو تو کرتا ہے باور کوثر و غلمان و حور!
یہ سبھی ہیں جلوہ ہائے عالمِ جذب و سرور

زندگانی اس جگہ دیدار ہی دیدار ہے!
لذتِ دیدار یا پھر لذتِ گفتار ہے!

شرف النساء کا ایوان

میں نے پوچھا کس کا یہ ذیشان قصرِ لعلِ ناب
یہ جو لیتا ہے بصد شوکت خراجِ آفتاب؟

یہ مقام اور منزلِ ذیشان، یہ ایوانِ بلند
حوریانِ خلد بھی جس پر مدام احرام بند!

اے کہ بخشا سائلوں کو تو نے ذوقِ جستجو
کس کا ایوانِ فروزاں ہے ہمارے روبرو

ہے یہ قصرِ دلربا کاشانۂ شرف النساءؑ
طائرِ بام اس کا ہے کروبیوں کا ہم نوا!

اپنے قلزم نے کہاں پیدا کیا ایسا گہر!
بطنِ مادر سے ہوئی کب ایسی دختر جلوہ گر

خاکِ لاہور اس کے مرقد سے حریفِ آسماں
کون جانے اس جہاں میں اس کے اسرارِ نہاں

وہ کہ سر پا تا بکفی ذوق و شوق و جانِ درد و داغ
دودمانِ حاکمِ پنجاب کی چشم و چراغ

پیکرِ زیبا فروغِ دیدۂ عبد الصمد
فقر جس کا نقش ہے دنیا پہ تا روزِ ابد

تاکہ پاکیزہ بنے قرآن سے اس کا وجود
وہ رہی محوِ تلاوت بے نیازِ ہست و بود

زیبِ تن تیغِ دو دم، شام و سحر قرآں بدست
تن بدن، ہوش و حواس اور قلب و جاں اللہ مست

کنجِ خلوت، تیغِ جوہر دار، قرآن و نماز
اے خوشا وہ زندگانی مست و سرشارِ نیاز

وقتِ آخر جب لبوں پر آ رہی تھی اس کی جاں
دیکھا مشتاقانہ اس نے سوئے اُمِ مہرباں

اور کہا تم راز میرا جاننا چاہو اگر!
دیکھو یہ شمشیر، یہ قرآں کہ ہیں میری سپر

ہیں یہی دو قوتیں پشت و پناہِ یک دگر
کائناتِ زندگی کا محور اور تقدیر گر!

اس جہانِ آب و گل میں ہیں جہاں سب رفتنی
آپ کی بیٹی کے تھے محرم یہی حافظ یہی!

ہے یہی صرف آپ سے ہنگامِ رخصت التجا
تیغ و قرآں ہوں نہ دونوں میرے مرقد سے جدا ۱۴۳۰

اس گذارش کی زہے قسمت اگر تعمیل ہو
مقبرہ میرا سدا بے گنبد و قندیل ہو!

مومنوں کے واسطے ہیں تیغ اور قرآں ہی بس
میری تربت کے لئے یہ سائبان یہ ساماں ہی بس

الغرض برسوں ہی زیرِ گنبدِ زریں قباب!
اس کے مرقد پر رہی موجود شمشیر و کتاب!

اس کا مرقد آبرو بخشِ جہانِ بے ثبات!
اہلِ حق کو مدتوں دیتا رہا درسِ حیات!

مدتوں تا آنکہ مسلم ایسے درماندہ ہوئے
گردشِ دوراں نے ان کے ٹھاٹھ الٹ کر رکھ دیئے

مردِ حق کو غیرِ حق سے دل میں ہول آنے لگا
شیرِ مولا روبہی کے طور دکھلانے لگا!

اس کے دل سے تاب و تب سیماب کی رخصت ہوئی
جانتے ہو خوب کیا پنجاب کی حالت ہوئی؟

بے محابا خالصہ شمشیر و قرآں لے گئے!
اس زمیں سے شوکت و شانِ مسلماں لے گئے!

امیرِ کبیر حضرتِ سید علی ھمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری کی زیارت

اس بیاں سے مرشدِ رومی کے، سینہ جل اٹھا
ہائے وہ خطہ گرامی کشورِ پنجاب کا!!

دل کو احوالِ عزیزاں کی خلش تڑپا گئی
خلد میں بھی قلب و جاں پر مردنی سی چھا گئی

چند ے یہ حالت رہی پھر اک صدائے دردمند
حوضِ کوثر کے کنارے سے ہوئی ناگہ بلند

مشتِ خس کی جمع تن من کو جلانے کے لیے!
گل سمجھتا ہے بہم کی آشیانے کے لیے!

دیکھ جو کچھ آگے آئے رومی فرمانے لگے!
مت بنا سوہانِ جاں گذرے دنوں کے سانحے

شاعرِ رنگیں نوا کشمیر کا طاہر غنی!
فقر اس کا منفرد، باطن غنی، ظاہر غنی

وہ کہ جو تھا بادۂ فیضان سے مستِ دوام
نغمہ خواں رہتا تھا پیشِ سید والامقام

سید السادات، سالارِ عجم، نازِ حرم!
دستِ معجز کار سے معمارِ تقدیرِ امم

درسِ اللہ ہُو غزالی کا اسی درگاہ سے
ذکر و فکر اس کا انہی کی آلِ حق آگاہ سے

مرشدِ روشن ضمیر خطۂ جنت نظیر!
میر و درویش اور سلاطین و اکابر کا مشیر!

خطے پر ابرِ کرم یہ شاہِ دریا آستیں!
اس نے بخشے اسکو علم وصنعت وتہذیب ودیں
اس کے دم سے ہی ہوا پیدا وہ ایران صغیر[1]!
جس کو ہے نازِ ہنر ہائے بدیع و دلپذیر
اک نگاہِ تیز اس کی کھوئے گرہیں صد ہزار!
کرے اس کے ناوکِ دلدوز سے سینہ فگار"

شاہِ ہمدان کے حضور میں

زندہ رود

چاہتا ہوں آپ سے اس سرِ یزداں کی کلید
کر کے اک شیطان پیدا ہم سے طاعت کی امید؟
اس قدر زشت اور ناخوش کو بنانا خوشنما
اور پھر ہم سے تقاضا نیکیٔ اعمال کا!!
ہے فسوں سازی خوش و ناخوش کی طرفہ ماجرا
ان غلط افتادہ مہروں سے بھلا بازی ہو کیا
مشتِ خاک اور ایک چکر درمیانِ آسماں
خود ہی کہئے یہ روش کیا اس کے ہے شایانِ شاں
اپنی قسمت کار ہیں، افکار ہیں آزار ہیں
دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ ہم لاچار ہیں

۱۔ ایران صغیر یعنی کشمیر

شاہِ ہمدان

بندۂ آگاہ جو رکھتا ہے آپ اپنی خبر
منفعت بخش اسکے ہاتھوں میں ہوں اسبابِ ضرر

آدمی کو صحبتِ ابلیس ساماں وبال!
اور اس کے ساتھ رزم آرائیاں وجہِ جمال!

عینِ خیرِ ابلیس سے تیرا ستیزِ جاوداں!
تیری ہستی تیغِ برّاں اور وہ سنگِ فساں!

تندتر ہو تا کہ تیری مار ہو ضربِ گراں!
ورنہ ہے دونوں جہاں میں بختِ بد آشوبِ جاں!

زندہ رُود

اس جہاں میں تشنۂ خوں آدمی کا آدمی!
پرورش پاتی ہے اک ملت کے خوں پر دوسری

دل غمِ کشمیر میں جلتا ہے مانندِ سپند
دل سے اٹھتے ہیں ہزاروں نالہ ہائے دردمند

کسقدر فرزانہ قوم اور خال و خط جادو نشاں
جس کے اعجازِ ہنرمندی کا قائل اک جہاں

اس کا ساغر اس کے اپنے خون میں ڈوبا ہوا
نالۂ نے میں مرے پنہاں اسی کا ماجرا!

اہلِ خطہ ہو گئے ہیں جب سے محرومِ خودی
ہو گئے ہیں آپ ہی اپنے وطن میں اجنبی!

دوسروں کے ہاتھ میں ہے مزدِ کارِ ساکناں
اس کے دریاؤں کی مچھلی ہے نصیبِ دیگراں

کارواں سارے سوئے منزل رواں ہیں گام گام
لیکن ان کا کام بے ڈھنگا، ادھورا اور خام!

مر گئے جذبے غلامی سے دلِ بے تاب کے
بجھ گئے شعلے جو پنہاں تاک کی رگ رگ میں تھے

پہلے کب تھی قوم کی یہ مستقل درماندگی
کب درِ اغیار پر اس کی جبیں سائی رہی

اک زمانے میں رہی ہے چیرہ دست و صف شکن
پائمردی اور جانبازی میں ممتازِ زمن

دیکھ تو کشمیر کے آئینہ پیکر کوہسار
ان کے اوپر شعلہ انگن آتشیں دستِ چنار

لعل اگلتا ہے بہاروں میں کچھ ایسے سنگ سنگ
خاک کے دل سے امنڈ آتا ہے اک طوفانِ رنگ

ابر پارے اڑتے ہیں کچھ اس طرح کہسار میں
جیسے گالے روئی کے دھننے کی دھنکی سے اڑیں!

کوہ و دریا اس کے دیکھے اور غروبِ آفتاب
شاہدِ حق کا ہوا دیدار ان میں بے نقاب!

ہمرہِ موجِ نسیم اک دن میں سیارِ نشاط[1]
نغمہ بر لب "بشنو از نے" سے تھا سرشارِ نشاط!

اک پرندہ گا رہا تھا شاخساروں میں کہیں
یہ بہاریں ایک کوڑی بھی بہا رکھتی نہیں!

نرگسِ شہلا کھلی اور لالے ہی لالے کھلے
بادِ نوروزی سے غنچے چاک داماں ہو گئے!

مدتوں کھلتے رہے بالائے ہر کوہ و کمر
نسترن نورِ قمر سے بھی کہیں پاکیزہ تر!

گل بداماں بارہا ہوتی رہی یہ سرزمیں
پھر شہاب الدین[2] مگر اس سے کوئی اٹھا نہیں

---

۱ - نشاط باغ - ۲ کشمیر کا اک نامور حکمراں -

نالہ اس مرغِ سحر کا تھا کچھ ایسا شعلہ زا: میرے دل میں اس نے اور اک سوز پیدا کر دیا
دیکھا اس عالم میں اک دیوانہ سرگرمِ خروش چھین کر جوے گیا یکسر متاعِ صبر و ہوش!

چھوڑ بھی ہم سے کر نہ طلب دیوانوں کی مستانہ ہو
شاخِ گل کو چھوڑ کہ ہے یہ محض طلسمِ رنگ و بو!
کیا کہا برگِ لالہ سے یہ اوس کی بوندیں ٹپکی ہیں؟
اے نادان یہ کوئی دل ہے جو گریاں ہے کنارِ جو
کہاں یہ مشتِ بال و پر اور کہاں یہ نغمہ درد آگیں
روحِ غنی کی نالہ کناں ہے مرگِ تمنا پہ ہر سُو!!
کبھی جنیوا سے جو گذر ہو کہیں ترا اے بادِ صبا!
قوموں کی مجلس کو اتنی بات فقط کہہ دینا تو
بیچے دہقاں، کھیت، خیاباں، دریا، بستی کی بستی!
بیچ دی قوم کی قوم اور وہ بھی میرے خدا اتنی سستی!

شاہِ ہمدان

آ بتاؤں تجھ کو اک باریک نکتہ اے پسر تن سراپا خاک ہے اور جان پاکیزہ گہر

جان کی خاطر ہے لازم کیجئے تن کو گداز
خاک سے اس پاک گوہر کا ہے لازم امتیاز

قطع کر دے تو اگر اپنا کوئی عضوِ بدن
تجھ سے ہوتا ہے ہمیشہ کو جدا وہ جزوِ تن

لیکن اس کے بالمقابل جاں اگر ہو جلوہ مست
ہاتھ سے جا کر بھی آ جاتی ہے واپس بے شکست

اس کے جوہر کے مماثل کوئی بھی جوہر نہیں
بند میں ہوتے ہوئے بھی بند کے اندر نہیں

گر بچائے رکھیں بن جائے بدن اس کا کفن
اور لٹا دیں تو ہو یہ وجہ فروغِ انجمن!

تم جو پوچھو گے کہ آخر کیا ہے جانِ جلوہ مست
وہ ہے تسلیم جاں کیا اے ندیمِ حق پرست

ہے یہی تسلیم جاں خود کو سپردِ حق کریں!
سوزِ جاں سے کوہ کو پگھلائیں اتنا تپ اٹھیں

جلوہ مستی بازیابی ہے خود اپنے آپ کی!
ظلمتِ شب میں ستاروں کی طرح تابندگی

کیفرِ ناخود شناسی ہے فنا و نیستی!
خود شناسی خود کو ہے ترجیع اپنے آپ کی

جس نے دیکھا خود کو اور دیکھا نہ کچھ اپنے سوا
قیدِ زنداں سے اسے پروانۂ رخصت ملا

جو بھی اپنی ذات کے جلووں سے خود سرشار ہو
نوش سے بہتر سمجھتا ہے کہیں وہ نیش کو

اسکی نظروں میں مثالِ باد ہے آزاد جاں
اس کے آگے کیا ہے زنداں اک ہیولا ناتواں

تیشہ کر دیتا ہے اسکا سنگِ خارا پاش پاش
اس جہاں سے کر کے ہی رہتا ہے حاصل وہ معاش

جان سے گذرے تو اسکی جاں میں پھر آ جائے جاں
ورنہ جاں دو چار ہی لمحے ہے اس کی مہماں

زندہ رود

اے خوش شرح و بیانِ حکمتِ خوب و خطا
پیرِ دانا چند نکتے اور ہوں ایسے عطاء!

مرقدِ باطن شناسا ذاتِ والا آپ کی!
محرمِ اسرار[1] شاہاں چشمِ بینا آپ کی

ہم فقیر اور حکمراں ہے طالبِ باج و خراج
یہ بتا دیں کیا ہے اصلِ اعتبارِ تخت و تاج!

شاہِ ہمدان

اصلِ شاہی کیا ہے؟ کیا ہے رسم و راہِ شرق و غرب
یہ فلاحِ خلق ہے یا کار و بارِ شرق و غرب

صاف کرتا ہوں بیاں اے صاحبِ والا مقام
باج دینا جز دو انسانوں کے ہے یکسر حرام

ایک مصداقِ اولی الامر، اس کی منکم شرطِ صاف
حجت و برہاں میں جس کی آیۂ حق واشگاف

یا جواں مردِ دلاور مثلِ صرصرِ تند و تیز
ملک گیر اور بے محابا جاں بکف محوِ ستیز

روزِ کیں کشور کشائی میں سراپا قاہری
روزِ صلح آئینہ دارِ شیوہ ہائے دلبری

۱- حضرت شاہ ہمدان کی ایک تصنیف "کتاب الملوک" کی طرف اشارہ۔

ہم اگر چاہیں خریدیں ہند و ایراں کی زمیں
بادشاہی کی خریداری مگر ممکن نہیں

جامِ جم کے واسطے اے صاحبِ عقل و ہنر
کوئی جاتا ہے کہیں پیشِ دکانِ شیشہ گر

اور مل بھی جائے تو آئینہ پھر آئینہ ہے
ٹوٹ جانا آئینے کی قسمتِ دیرینہ ہے

غنی

ہند کو یہ ذوقِ آزادی عطا کس نے کیا؟
صید کو سودائے صیادی عطا کس نے کیا.

یہ تھے باحکمت برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ صحرا تھے جن کے روئے احمر سے خجل

تیز گام و تیز ذہن و پختہ کار و سخت کوش
جن سے برپا ہے دلِ افرنگ میں درد و خروش

زادبوم ان کی ہماری خاک دامنگیر ہے
یعنی ان تاروں کا مطلع خطۂ کشمیر ہے

تو سمجھتا ہے اگر اس سرزمیں کو بے شرر
اک ذرا آپ اپنے باطن کا بھی تو نظارہ کر

ہے کہاں سے تیرے قلب و روح کا سوزِ دروں
اور دمِ بادِ بہاری کا نشاط افزا فسوں؟

یہ وہی موجِ ہوا ہے رنگ و بو کی مایہ دار:
جس سے کیف و رنگ پاتے ہیں ہمارے کوہسار

کیا تجھے معلوم ہے اک دن دلہٗ میں بے قرار
موج سے اک موجِ مضطر کہہ رہی تھی بار بار

تا بکے اک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی رہیں
اٹھ کہ اک دو لمحے کو ساحل سے بھی ہم جا بھڑیں

---

۱ - کشمیر کا مشہور نالہ

دیکھو تو دودھوں پلا اپنا یہ دریائے کہن
ہے جو کہساروں میں رہتا رات دن شورش فگن

پارہ ہائے سنگ سے ہے رات دن ٹکرا رہا
دُنیا ہے کہسار کے پرزوں کے یہ پرزے اُڑا

وہ جواں جسکی ہیں یہ شہر و دشت میں جولانیاں
شیرِ صد مادر سے ہے پروردہ جس کا جسم و جاں

اسکی سطوت اہلِ دنیا کے لیئے محشر نشاں
ہے بحارہ الخنتِ جاں کون اور کہاں ہے اسکی ماں

اس طرح جینا درِ ساحل کہ ہے بے فائدہ
ایک سنگِ راہ ہے اپنے لیئے ساحل ہے کیا

قعرِ دریا میں رہیں ہر چند غلطاں صبح و شام
کرلیں ہم ساحل سے سمجھوتا تو ہے مرگِ دوام

کوہ و صحرا میں مسلسل گرمِ جولاں زندگی
اے خوشا وہ موج جو ساحل سے آگے چل پڑی!

اے کہ روشن تجھ پہ ہے خطِ دلآرائے حیات
اے کہ بخشا تو نے مشرق کو ہے غوغائے حیات

اے کہ حاصل ہے تجھے وہ آہِ سوزاں پُر شرر
جس سے تو بیتاب ہے اور تجھ سے ہم بیتاب تر

اے کہ تیرے زم سے مرغانِ چمن میں ہائے و ہو
اے کہ سبزہ آنسوؤں سے تیرے کرتا ہے وضو

اے کہ کشتِ لالہ و گل تیرے سینے سے اُگی
ہے تری امید سے سینوں میں لو امید کی

کاروانوں کے لیئے تیری صدا بانگِ درا
کیوں ہے اہلِ خطہ سے نومید اے اہلِ رجا؟

ان کے سینوں میں دلِ سوز آشنا مردہ نہیں
ان کا انگارا ابھی زیرِ یخ افسردہ نہیں

ایک وقت آئے گا ایسا بھی کہ بے آوازِ صُور
ساری ملت اٹھ کھڑی ہوگی لحد سے ناصبور

غم نہ کھا اے بندۂ صاحب نظر، نغمہ جگر
آہ سوزاں کھینچ ایسی جو جلادے خشک و تر

شہر ابھی ہیں ان گنت زیرِ سپہرِ لاجورد
راکھ جن کو کر گیا سوزِ دلِ درویش مرد

ہے بنائے سلطنت نازک ترا زجامِ حباب
اک ذرا سی پھونک سے کر سکتے ہیں اسکو خراب

ہے نوا صورت گرِ تہذیب و تقدیرِ امم
ہے یہی سرمایۂ تخریب و تعمیرِ امم

تیرا نشتر گرچہ سینوں میں خلش افزا ہوا
ہاں مگر تیری حقیقت کو نہ کوئی پا سکا

ہے بظاہر راگ تیرا گو نوائے شاعری
در حقیقت تیری لے ہے مادرائے شاعری

تازہ ہنگامہ بپا کر جنت الفردوس میں
اک نئی پیدا نوا کر جنت الفردوس میں

زندہ رود

خوگرِ نشۂ درویشی ہو اور دمادم دور چلے
جب پختہ میخوار بنے تب کشورِ جم سے ٹکرلے

پوچھا کیا یہ جہان ہمارا ساز ہے یا ناساز تمہیں
میں نے کہا "ناساز سراسر" کہا "اسے برہم کر دے"

مے خانوں میں دیکھا لیکن کہاں حریف شائستہ
رستم ہو تو دادِ طرب دے، پنجوں سے کم دور چلے

لالۂ صحرا لالۂ صحرا، تنہا تنہا جلنا کیا
داغِ جگر افروز یہ اپنا سینۂ آدم کو بھی تو دے
تو ہی سوزِ دردوں ہے اسکا تو ہی اس کا گرم لہو
نہیں ہے باور، چیر کے دیکھ لے اندر سینۂ آدم کے
عقل چراغ ہے تیرا اسکو چھوڑ بھی دے سرِ راہگذر
عشق ایاغ ہے تیرا، دادِ عیش دے بندۂ محرم سے
پارہ پارہ دل کے ٹکڑے آنکھوں سے ٹپکاؤں میں
لعل ہوں لعل انمول مجھے انگشتری میں اپنی جڑ لے

ہندی شاعر بھرتری ہری سے ملاقات

حوریانِ خلد الیوانات میں محوِ قیام
میری بانگِ شوق ان کو دعوتِ سوزِ تمام

ایک نے باہر نکالا خیمۂ اطلس سے سر
دوسری تکتی رہی غرفے سے باہر جھانک کر

جو بھی تھے خلوت نشینانِ خیابانِ ارم!
ان کے دل کو میں نے بخشا اس زمیں کا دردِ غم

مسکرایا زیرِ لب فرخندہ پیرِ پاک زاد!
اور فرمایا کہ "اے جادوگرِ ہندی نژاد!

دیکھ وہ شاعرِ گرامی ہند کا جادو اثر
اوس کی بوندیں نظر سے جبکی ہوں سلکِ گہر!

مردِ دانا مردِ حق نامِ مبارک بھرتری
طبع جس کی ابرِ نیساں کی طرح موتی بھری

باغ سے چنتا نہیں جز غنچہ ہائے نیم وا
کھینچ لایا ہے اسے تیرا کلامِ سحر زا

ایک راجہ جس کے نغموں میں نہاں جادوگری
حق پرستی کی زمانے بھر میں جس کی دھوم تھی

کسقدر رعنائیٔ الفاظ اور فکرِ رسا!
ایک دو لفظوں میں سو رازوں کا دیتا تھا پتا

جانتا ہے نغمۂ ہستی کا سارا زیر و بم
جامِ جم اسکا کلامِ دلنشیں اور آبِ جم!

چل پڑے ہم بہر تعظیم ہنر اس کی طرف
تاکہ حاصل ہو ہمیں اس سے تکلم کا شرف

زندہ رود

اے کہ تو نے کھول دی ہیں ایسی باتیں گن بھری
جن سے پورب بن گیا انمول باتوں کا دھنی

ہے کہاں سے من میں آتی کویوں کے سلگن بتا
آتما ہے کوکھ اس دیپک کی یا پرم آتما؟

بھرتری ہری

پا سکے سنسار میں کوئی کوی کا کھوج کیا
اپنے گیتوں ہی کی لے میں اُس کا ملتا ہے پتا

ایشور کے دوار بھی بے چین رہتی ہے یونہی
وہ جو ہے من کی جلن دھرتی میں بھگتوں کو ملی

کھوج لیتے رہنا بھیدوں ہی کا جیون کو لبھائے
اور سلگن بھی کو تیا ان امنگوں ہی سے پائے

تو جو ہے کو تیا کے کومل روپ کا رسیا، تجھے
ہاتھ آجائے یہ گن تو بات اتنی جان لے

اک دو میٹھے بولوں ہی سے اس کٹھن سنسار میں
ہم جو چاہیں تو الپسراؤں کے دل کو موہ لیں

زندہ رود

آج ہندی جانے کن الجھیڑوں میں ہیں پھنس گئے
کوئی شبھ بول ان کی اس الجھن میں جو کام آسکے

بھرتری ہری

یہ دیویاں دیوتا پتھر کے، چھوڑو ان میں کیا رکھا ہے
یہ مندر اور شوالے کیا، ان سے اتم پرم آتما ہے
وہ پوجا تری کیا پوجا ہے جو کام کا روپ دھار سکے
کچھ کرتے رہنا جیون ہے، جیسا بھی برا یا اچھا ہے

کہتا ہوں کھری اک بات، تمہیں جس کو اس جگ میں کم جانیں
اچھا ہے کہ رکھ لو من میں اسے، انمول بڑی یہ مایا ہے
یہ جگت جسے تو دیکھتا ہے، لیلا یہ کہاں بھگوان کی ہے!
پرکھاہے نرک اور سورگ بھی جو ہاتھوں سے تو اپنے کاٹتا ہے!
جیسا بھی کروگے ویسا ہی تم انت اس کا پھل پاؤ گے
یہ سورگ اور نرک تو کچھ بھی نہیں سب کیا دھرا یہ اپنا ہے

سلاطینِ مشرق کے ایوانوں میں نقل و حرکت

بس گئی میرے دل و جاں میں نوائے بھرتری
مست و بے خود کر گئی مجھ کو نوائے بھرتری

بولے رومی خوب ہے گر چشمِ دل بیدار ہو
حرکتِ انساں برونِ حلقۂ افکار ہو

تیرا درویشوں کے حلقوں میں ہوا اب تک گذر
کاخ و ایوانِ سلاطیں کا بھی کچھ نظارہ کر

دیکھ یہ شاہانِ مشرق کی یگانہ انجمن
جس میں یکجا سطوتِ ایران و افغان و دکن

ایک نادر شاہ، وہ دانائے رمزِ اتحاد
بخشنے والا مسلمانوں کو پیغامِ وداد

دوسرا ابدالی جس کی ذات یزدانی نشاں
جس نے ڈالی کفتی بنائے ملتِ افغانیاں

اور وہ مردِ حُر، شہیدانِ محبت کا امام
جس کی ہستی آبروئے ہند و چین و روم و شام!

نام ہے جس کا مہ و خورشید سے تابندہ تر
قبر کی مٹی بھی جس کی ماہِ نو سے زندہ تر!

عشق کا سرِ نہاں اس نے ہویدا کر دیا!
اس طرح جاں دی کہ ہے جانبازیوں کی انتہا

ہائے وہ فیضِ نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
فخرِ سلطانی کے شایاں وارثِ جذبِ حسین

چھوڑ کر رخصت ہوا وہ یہ سرائے ہفت روزہ
پھر بھی ڈنکا پٹ رہا ہے اس کا دکن میں ہنوز

میرے الفاظ اور نقوشِ فکر ہیں ناقص تمام
پھر عیاں ہو کیسے اس کی شان مافوق کلام!

ہوں ملائک عرش کے بھی اس کے سر سے بے بصیر
زندہ و بیدار و دانا اور گویا و خبیر!

قصر کے دیوار و در فیروزہ سے آراستہ
اس کی گودی میں فلک کا گنبدِ افراختہ

اس کی رفعت ماورائے پرسشِ چند و چگوں
کرتی ہے فکرِ فلک پیما کو بھی خوار و زبوں!

وہ گل و سرو و سمن، وہ لہلہاتے شاخسار
سب لطافت ہی لطافت مثلِ تصویرِ بہار!

سارے اوراقِ گل و برگ و شجر جادو اثر
دمبدم ذوقِ نمو سے جلوہ و رنگِ دگر۔

اس قدر بادِ صبا کی برق وش جادو گری!
دیکھتے ہی دیکھتے ہو زرد گلناری پری!

ہر طرف فوارے ہی فوارے تھے گوہر فروش
طائرانِ زادۂ فردوس سرگرمِ خروش!

بارگہ اک اندرونِ محیطۂ کاخِ بلند!
جسکا ہر ہر ذرہ صد ہا آفتاب اندر کمند!

اس کے بام و در ستوں، مثلِ عقیقِ شعلہ فام
مرمریں فرشوں پہ میناکاری لعلیں تمام!

پہنے زریں پیٹیاں تھیں دائیں بائیں بے شمار
مثلِ پریوں کے کھڑیں حوریں قطار اندر قطار!

در میاں بیٹھے ہوئے اورنگ زر پہ باجلال
خسروانِ جم حشم، بہرام فر، گردوں مثال!

"آئینۂ حسنِ ادب کا رومی پرآگہی
اس نے لب کھولے سخن کو باکمال دلبری

یہ یگانہ شاعرِ شیریں نوائے خاوراں!
جس کو کہیے ساحرِ حیرت فزائے خاوراں!

فکر میں باریکیاں اور جان و دل درد آشنا
ہے بپا مشرق میں اس کی شاعری کا غلغلہ"!

نادر

اے کہ زیبا ہے تجھے تاب و تبِ حرفِ دری
آئے آنکھوں پر ہماری نکتہ سنج خاوری

محرمانِ راز ہیں ہم راز کی باتیں بتا
ہاں بتا ایران کا جو جانتا ہو ماجرا

زندہ رود

بعد مدت اس نے وا کی آنکھ اپنے آپ پر
پڑ گیا اک دام کے حلقے میں لیکن بے خبر

فتنۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ و سحر فن
خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگِ پُرفتن!

کوتہ اندیشی سے بے وارفتۂ ملک و نسب
اس کا مضموں ذکرِ شاپور اور تحقیرِ عرب!

یک قلم بیگانۂ جوش و خروشِ واردات
بس وطن کا ہو رہا ہے آپ کو بھولا ہوا!

ہے قبور کہنہ و ویراں سے جویائے حیات!
دل فدائے رستم اور حیدر سے ہے قطعِ ولا

نقشِ باطل پا لیا اس نے فرنگستان سے
سرگذشت اپنی سنے ابھی وہ تو غیروں سے سنے!

پیرئ ایراں سراسر تھا نہ مانِ یزدِ جرد!
دین و آئیں اس کا پارینہ نظام اس کا کہن
اس کے انگوروں کی شریانوں میں مے جولاں نہ تھی
پہنچی اس عالم میں صحرا سے صدا حشر آفریں
یہ حیاتِ تازہ ہے اکرامِ ربِ دو جہاں
بس کے تن سے پاک جاں کی حد تیں رخصت ہوئیں
مردِ صحرائی نے ڈالی جان پھر ایران میں!
نقشِ کہنہ کو کھرچ ڈالا جلا دی چل دیا!
خود کو پگھلایا عجم نے آتشِ افرنگ سے!

چہرہ پژمردہ کہ شریانوں میں خوں تھا خونِ سرد
صبح کی ضو شام کی ظلمت تھی سر تا سر کہن!
راکھ تھا، دل میں شراروں کی چمک پنہاں نہ تھی
جس نے پھر بخشی اسے تابِ حیاتِ آتشیں!
پارس باقی رہ گیا ہے رومۃ الکبریٰ کہاں؟
خاک سے پھر پیشتر از حشر اٹھ سکتا نہیں
اور پھر گم ہو گیا وہ اپنے ریگستان میں!
برگ و سازِ عصرِ نو دیکھ مرخص ہو گیا!
اف رے احساں ناشناسی! کوئی اسکو کیا کہے

ناصر خسروِ علوی کی روح نمودار ہوتی ہے
اور یہ غزلِ مستانہ پڑھ کر رخصت ہو جاتی ہے

ہاتھ کو مرکب بنایا جب قلم اور تیغ کا!
فکر مت کر خواہ وہ معذور ہو یا خستہ تن
فن سرِ شمشیر یا نوکِ قلم سے ہو عیاں
نور جیسے نار سے اور نارِ خس سے شعلہ زن
تر دبے دیں بے ہنر ہیں کلک کیا شمشیر کیا
دیں نہ ہو تو کچھ نہیں کلک اور آہن کا ثمن
دیں ہو دانا سے گرامی اور نادانوں سے خوار
سامنے ناداں کے دیں، گائے کے آگے یاسمن
ایسا کپڑا نصف سے جس کے قبا الیاس کی
اور ہو تیارہ باقی سے یہودی کا کفن!

ابدالی

جس نے پیدا کی تھیں اقلیمیں کئی وہ نوجواں
اپنے کوہستاں کے غاروں کو ہوا واپس رواں

اس کے کوہستاں میں بھڑکا ایک شعلہ جنگ کا
اس سے وہ نکلا کھرا یا جل کے خاکستر ہوا؟

زندہ رود

اور قومیں ہیں اخوت سے جہاں میں تند و تیز
اس کے ہاں خود بھائی سے بھائی ہے سرگرمِ ستیز

زندگی سے اس کی ہے اقوامِ مشرق کی حیات
طفلِ دہ سالہ بھی اک جنگ آزما معجز صفات!

پھر بھی اتنی بے خبر، خود کو کیا خود سے جدا
ممکنات اپنے نہ پہچانے، یہ کچھ قدرِ خودی

دل تو رکھتی ہے مگر بیگانۂ احوالِ دل!
تن سے تن، دل سے جدا دل، ایک دردِ لاینحل

منزلِ مقصود کا ہر دو نہیں دانائے راہ
وائے معذوری کہ مقصد پر نہیں اس کی نگاہ!

خوب ہے فرمودۂ خوشحال خاں افغاں شناس
صاف کہہ دیتا تھا وہ حق بات بے خوف و ہراس!

وہ حکیم نکتہ دانِ ملتِ افغانیاں!
وہ طبیبِ کاروانِ ملتِ افغانیاں

رازِ حق کو شوخیٔ رندانہ سے افشاء کیا

"اتفاقاً دیکھ پائے اونٹ اگر افغانِ حُر
باہمہ سازو یراق اور حاملِ مرجان و دُر
ہمت اس کی پست ہے اتنی، کہاں انبار دُر
شاد ہو جائے فقط سن سن کے خلخالِ شتر"

ابدالی

جسم کی بیداریاں کیا، خواب کیا، ان کا نشاں
تن کی ہو جاتی ہے مرگِ دل سے یوں حالت زبوں
دل بگڑ جائے تو ہو جاتا ہے ناکارہ بدن!
فرض کیجے ایشیا کو گر نہادِ آب و گِل!
ہے فساد اس دل کا سامانِ فسادِ ایشیا!
جب تلک آزاد ہو دل جسم بھی آزاد ہے
جسم کے ماتند وابستہ ہے اک آئیں سے دل

دل ہے جس سے پیکرِ انساں میں ہے تاب و تواں
ہر بُنِ مو سے پسینہ بن کے بہہ جاتا ہے خوں!
آنکھ دل پہ رکھ، نہ ہو جز دل کسی شے سے لگن!
ملتِ افغانیہ ہے اس کے اندر ایک دل!
اور کشادِ اس کی ہے سامانِ کشادِ ایشیا!
ورنہ وہ کیا شے ہے اک تنکا برائے باد ہے!
مردہ ہو جاتا ہے کیں سے اور زندہ دیں سے دل!

دین کی قوت کا ہے وحدت ہی پر دار و مدار
جلوہ آرائی سے وحدت کی ہو ملت آشکار!

خود سے لے جاتی ہے مشرق کو پئے تقلیدِ غرب
چاہیے تقلید کے بر عکس اسے تنقیدِ غرب

قوتِ مغرب نہیں منت کشِ چنگ و رباب
اور نہ ہے موقوف رقصِ دخترانِ بے حجاب!

ہے نہ اس کی وجہ سحرِ ساحرانِ لالہ رُو!
اور نہ عریاں ساقِ سیمیں یا شعارِ قطع مُو!

ترکِ دیں باعث نہیں ہے اس کے استحکام کا!
خطِ لاطینی نہیں کچھ باعثِ نشو و نما!

علم و فن افرنگ کا سرچشمۂ تاب و تواں!
ہے اسی روغن سے اس کی شمع محفل ضو فشاں!

اکتساب ان کا نہیں موقوف قطع جامہ پر
جبّہ و عمامہ کب ہیں مانعِ علم و ہنر

بہرکسب علم و حکمت اے جوانِ شوخ و شنگ
عقل و دانش کام آتی ہے نہ ملبوسِ فرنگ

جز بصیرت یاں کسی بھی چیز کی حاجت نہیں
یہ کلہ یا وہ کلہ، ان کی کوئی وقعت نہیں

ذہنِ پست و چاق ہی کافی ہے انساں کے لئے
ایسی طباعی جو لائے آگہی جاں کے لئے

طالبِ صادق اگر ہو خوگرِ دردِ چراغ
لازماً پاتا ہے علم و فن و حکمت کا سراغ!

ملکِ معنی بند ہو سکتی نہیں جس کی حدیں
بے جہادِ مستقل کب ہاتھ آتا ہے ہمیں

دیکھو تو وہ ترکِ از خود رفتہ دستِ فرنگ
زہرِ شیریں پی گیا بخشیدۂ دستِ فرنگ

چونکہ تریاقِ عراق اس کے تصرف سے گیا
میں کہوں اس کے سوا کیا اس کا حافظ ہو خدا

بندۂ افرنگ، وہ دلدادۂ ذوقِ نمود!
لے رہا ہے ساکنانِ غرب سے رقص و سرود

عیش و عشرت کی ہوس میں نقدِ جاں بھی ہار دے
اکتسابِ علم مشکل، نقلِ عیش آساں اسے

وہ تن آسانی سے کرتا ہے سہولت اختیار
اس کی نظروں میں ہے صرف آسانیوں کا اعتبار

ڈھونڈے آسانی کو گر دیر کہن میں آدمی
دیکھ لے کیسے بدن سے جان رخصت ہو گئی

زندہ رود

جانتا ہے تو کہ کیا ہے سرِ تہذیبِ فرنگ
اس کے جلووں نے جلا ڈالے ہیں لاکھوں خانماں
اس کا ظاہر کسقدر تابندہ و گیرندہ ہے!
آنکھ نظارہ کرے اور دل ہو مسحورِ فسوں
کون جانے عالمِ مشرق کی ہے تقدیر کیا

اس کی دنیا میں نہاں صد خلدزارِ کیف و رنگ!
کتنے ہی گلزارہ رنگیں، شاخ و برگ و آشیاں!
دل مگر کمزور ہے ذوقِ نظر کا بندہ ہے!
جھک کے اس بتخانہ کے آگے ہوا خود سرنگوں
جس نے دل ظاہر سے باندھا اس کی ہو تدبیر کیا

ابدالی

بات جو تقدیرِ مشرق پر ہے قادر وہ ہے کیا
پہلوی وہ وارثِ تاج و سریرِ کیقباد

عزم و حزمِ پہلوی و نادرہ معجز نما
عقدۂ ملکِ عجم کی جس کے ناخن سے کشاد

اور نادر مایۂ تاب و تبِ درّانیاں — جس سے قائم ہے نظامِ ملتِ افغانیاں
جان و دل شوریدۂ رنج و غمِ دین و وطن! — نکلے کہساروں سے اس کے غازیانِ صف شکن
اک سپاہی، اک سپہ گر، اک جہاندیدہ امیر — بر خلافِ دشمناں فولاد، اپنوں میں حریر!
اس پہ میں قرباں جو ہوا اپنی خودی سے آشنا — عصرِ حاضر کا خرد مندی سے اندازہ کیا

اہلِ مغرب مائلِ صد شیوہ ہائے دلبری
اوروں پر تکیہ بجائے خود سراسر کافری

سلطان شہید

ہاں سنا ہندوستاں جنت نشاں کی داستاں — تنکے تنکے پر تصدق جس کے سو سو بوستاں
مسجدوں سے اس کی سب ہنگامے عنقا ہو گئے — دیر میں بھی شعلۂ سوزاں فسردہ ہو گئے!
وہ کہ جس کے واسطے ہم نے دل اپنے خوں کیے — اپنی جانوں میں جلائے جس کی یادوں کے دیئے
اس کے غم کا خود ہمارے غم ہی سے اندازہ کر — ہائے یہ معشوقِ عاشق ناشناس و کم نظر

زندہ رود

اہلِ ہندوستاں ہیں رد گرداں ز قانونِ فرنگ — ہو سکا ان پہ نہ طاری سحر و افسونِ فرنگ

روح پر ہوتا ہے اک بارِ گراں آئینِ غیر
خواہ آئے از فرازِ آسماں آئینِ غیر

سلطان شہید

کس طرح انساں ابھر آتا ہے مشتِ خاک سے
سینے میں دل، دل میں ذوق و شوق کی دنیا لئے

ہے سرشتِ آب و گل عصیاں کا پیمانہ بھرے جام
غیر خود کچھ بھی نہ دیکھے، ہے یہی سودائے خام

چونکہ ہے عصیاں خودی تک دسترس دشوار ہے
جب تلک حاصل نہ ہو قسمت میں اپنی ہار ہے

تو نے زائر بن کے دیکھے ہیں مرے شہر و دیار
تیری آنکھیں بن گئیں پروانۂ شمع مزار!

اے کہ تیرا دل شناسائے حدودِ کائنات!
تو نے دیکھے ہیں دکن میں کوئی آثارِ حیات؟

زندہ رود

میں نے بوئے اشکوں کے موتی دکن کی خاک میں
لالے اگنے لگ گئے اس خطۂ نمناک میں!

رود کاویری ہمیشہ مستِ شوقِ رہبری
میں نے دیکھی اس کے دل میں اور ہی شوریدگی!

سلطان شہید

اے کہ بخشی تجھ کو فطرت نے نوائے دل فروز
تیرے اشکوں کی تپش سے آج تک ہے دل میں سوز

اے خوشا وہ کاوِ ناخنِ مردانِ راز
جس سے ہو جوئے خوں رواں ہو پھوٹ کر رگہائے ساز

وہ نوا پُر سوز تیرے سینے سے نکلی ہوئی!
سوز کر دیتی ہے پیدا دوسروں کے دل میں بھی!

میں ہوا ہوں حضرتِ مولائے کل میں باریاب
طے نہ ہوں بے جن کے یہ سب راستے پُر پیچ و تاب!

گو وہاں پر ہو کسی کو جرأتِ گفتار کیا
تاب کوئی روحِ انسانی کو جز دیدار کیا

گرمیٔ اشعار سے تیری مرا دل جل اٹھا
میرے لب پر تیرا اک جاں سوز نغمہ آگیا

پوچھا حضرت نے "یہ کس کا ہے کلام جانفزا؟
اس میں ہے ہنگامہ ہائے زندگی کا غلغلہ!"

ہاں اسی دلسوز لے میں جس سے جاں ہو شعلہ زن
رود کاویری کو پہنچا دے مرے اک دو سخن!

ہے جہاں میں تو بھی زندہ رود وہ بھی زندہ رود
اے خوشا قندِ مکرر! یہ سرود اندر سرود

سلطان شہید کا پیغام رودکاویری کے نام

زندگی و مرگ اور شہادت کی حقیقت

رودِ کاویری نہ ہو سیماب پا آہستہ چل!
چلتے چلتے تھک گیا ہے تو ذرا آہستہ چل!

مدتوں پر پیچ کہساروں میں تو نالاں رہا
کاوشِ مژگاں سے رستہ کاٹ کر جولاں رہا

اے کہ تو میرے لئے خوشتر ز جیحون و فرات
تیرا پانی ہے دکن کے واسطے آبِ حیات!

زینتِ آغوش تھا کیسا دیارِ دلربا!
حسن نوشیں جلوہ تیرے نوشِ جاں افزا سے تھا

تیری پیری میں بھی ہے اب تک وہی رنگِ شباب
جنتِ نظارہ وہ ہی رنگ و آب اور پیچ و تاب

موج نے پیدا نہ کچھ جز دانۂ گوہر کیا
یونہی لہرائے سدا یہ طرۂ پیچاں ترا!

اے کہ تیرا ساز ہے معمورِ سوزِ زندگی
کس کا ہے پیغام یہ، ہے کچھ تجھے معلوم بھی؟

جس کی سطوت کا طوافِ جاوداں تیرا شعار
دولت و اقبال کا جس کے رہا آئینہ دار!

وہ کہ صحرا جس کی تدبیروں سے ہمرنگِ جناں
ثبت نقش اپنا کیا جس نے بہ خونِ ارغواں!

وہ کہ جس کی خاک سے وابستہ صدہا آرزو
تیری موجوں کے تڑپنے کا سبب اس کا لہو!

سر بسر گفتار جس کی موجبِ کردار تھی
شرق محوِ خواب تھا اور اس کی جاں بیدار تھی

اے کہ تو اور میں ہیں دونوں موجۂ رودِ حیات
دمبدم تبدیل ہوتی رہتی ہے یہ کائنات

زندگی ہے انقلابِ دمبدم سے بیقرار
ہے تلاش اک عالمِ نو کی اسے لیل و نہار

تار و پودِ جملہ موجوداتِ عالم رفت و بود
رفت و بود آئینہ دارِ مستیٔ ذوقِ نمود!

رہروؤں کی طرح راہیں بھی ہیں سرگرمِ سفر
جس جگہ بھی دیکھئے پنہاں سفر پیدا حضر!

کاروان و ناقہ ہوں یا پا بگل دشت و نخیل
دیکھئے جس کو ہے شکوہ سنجِ آلامِ رحیل

پھول بھی گلزار میں ہیں میہمانِ یک نفس
رنگ و آب و تاب ان کا امتحانِ یک نفس

موسمِ گل کیا ہے ماتم بھی ہے ناؤ نوش بھی
غنچہ در آغوش بھی اور نعشِ گل بہ دوش بھی!

میں نے لالے سے کہا دکھلا ذرا پھر سوزِ جاں
جل کے بولا رازِ اپنا اب بھی ہے تجھ پر نہاں

ہے خس و خاشاک سے تعمیر ایوانِ وجود
کیا ہے حسرت کے سوا دنیا میں پاداشِ نمود

سوئے جولاں گاہِ ہست و بود آتا ہے؟ نہ آ
تو عدم سے جانبِ مشہود آتا ہے؟ نہ آ!

اور اگر آتا ہے تو جاں مت گنوا مثلِ شرار
والہانہ جستجو کر خرمنوں کی برق وار!

تاب و تب ہے تیرے سینے میں اگر مانندِ مہر
گرم جولاں ہو میانِ وسعت آبادِ سپہر!

کوہ و مرغ و گلشن و صحرا جو پیش آئے جلا
مچھلیوں کو زیرِ دریا کر دے آتش زیرِ پا!

سینہ رکھتا ہے اگر شائستۂ پیکانِ تیر
جینے اور مرنے میں ہو تیری روش شاہینِ تیر

چونکہ عرضِ زندگانی میں ہے پوشیدہ ثبات   قادرِ مطلق سے مانگا میں نے کب طولِ حیات!

کیا ہے آخر زندگی کی رسم و رہ اور کیش و دیں!

شیریٔ اکدم میشئ صد سالہ سے بہتر کہیں!

زندگی کو تقویت دیتی ہے تسلیم و رضا   موت کیا ہے محض نیرنگ و طلسم و سیمیا!

مردِ حق شیرِ ژیاں اور موت صیدِ آشفتہ کام   سو مقامات اس کے ہیں ازانجملہ ہے موت اک مقام!

موت پر انسانِ کامل ہے جھپٹتا اس طرح   ہے کبوتر پر جھپٹتا تند شاہیں جس طرح!

مرتا رہتا ہے تردد سے ہر اک لحظہ غلام   موت کے اندیشے سے ہے زندگی اس پر حرام

اور ہے کچھ شان لیکن بندۂ آزاد کی   موت اس کو بخشتی ہے از سرِ نو زندگی!

جو ہے خود اندیش کب رکھتا ہے ہر دم موت یاد   مرگِ آزاداں نہیں ہے ایک لمحے سے زیادہ!

ہو لحد انجام جس کا ایسے مرنے سے گذر   یہ ہے مرگِ دام و دد، مرگِ زبوں، ننگِ بشر!

مردِ مومن چاہتا ہے موت حق سے اور ہی   جس سے ہو آزاد اس خاکِ سیہ سے آدمی!

کیا ہے یہ مرنا سوائے انتہائے راہِ شوق!   آخری تکبیرِ بیباکانۂ جنگاہِ شوق!

گرچہ ہے ہر موت شیریں مردِ مومن کو مگر   ہے مقامِ مرگ فرزندِ علی نوعِ دگر!

جنگِ شاہانِ جہاں ہنگامۂ غارت گری   جنگِ مومن اقتضائے سنتِ پیغمبری!

جنگِ مومن انضمامِ خاصِ ہجرت سوئے دوست   ترکِ عالم کر کے عزمِ اختیارِ کوئے دوست!

جس نے حرفِ شوق کو اقوام پر روشن کیا   "جنگ ہے رہبانیِ اسلام"، اس کا قول تھا!

جانتا ہے کوئی اس نکتے کو تو وہ ہے شہید
جس نے اس نعمت کی اپنے خون سے کی ہے خرید

زندہ رود کی فردوسِ بریں سے روانگی

اور حورانِ بہشتی کا تقاضا

شیشۂ صبر و سکوں سب پارہ پارہ ہو گیا
"آؤ آؤ ہم چلیں" آہستہ رومی نے کہا

گفتگوئے دلنشیں اسکی پُر از جذب و یقیں
ہائے وہ ایوانِ عالی! ہائے وہ قصرِ بریں!!

پہنچا اس کے در تلک، تھے دیدہ و دل غرقِ خوں
وہ ہجومِ حوریاں اس در پہ سر تا پا فسوں!

ان کے ہونٹوں پر پیالے زندہ رود، اے زندہ رود
شاد باد اے زندہ رود اے صاحبِ سوز و سرود!

اک جہانِ شور و غوغا زیر و بالا دائیں بائیں
ایک دو لمحے ہمارے ساتھ بھی فردوس میں!

زندہ رود

وہ مسافر، مردِ رہ، آگاہِ اسرارِ سفر!
خوفِ منزل جسکو ہے رہزن کے ڈر سے بیشتر

۷۳۰ ہجر ہو چاہے وصال آسودہ ہو سکتا نہیں — عشق بے دیدِ جمال آسودہ ہو سکتا نہیں
ابتدائے عشق ہے پیشِ بتاں افتادگی — انتہا کیا؟ دلبروں کی قید سے آزادگی!
عشق بے پروا سدا دلدادۂ ذوقِ رحیل — کیا مکاں کیا لامکاں، دونوں میں وہ ابن السبیل!

مشربِ عشاق ہے مانندِ موجِ تیز گام
اختیارِ جادہ ہائے نو بنو، ترکِ مقام

حورانِ بہشت

اے سراپا شیوہ و نیرنگ مثلِ روزگار
ہو عنایت ہم کو بھی اک نغمۂ تیرا کیف بار

زندہ رود کی غزل

نہیں آدم ہی پایا تو خدا کو ڈھونڈتا کیا ہے — تو خود نا آشنا ہے، آشنا کو ڈھونڈتا کیا ہے؟
دوبارہ شاخ سے پیوستہ ہو کر کھینچ آب و نم — پریدہ رنگ تو بادِ صبا کو ڈھونڈتا کیا ہے
ہیں دو قطرے وہ خونِ دل کے جن کو اشک کہتے ہیں — غزالِ کعبہ تو دشتِ خطا کو ڈھونڈتا کیا ہے

عیارِ فکر کیا ہے؟ کشور آرائیٔ جہانگیری
سریرِ جم طلب کر بوریا کو ڈھونڈتا کیا ہے

جو ملتا ہے سراغ اس کا کہیں تو لالہ زاروں سے
تو مجھ سے میری خوں گشتہ نوا کو ڈھونڈتا کیا ہے

نظر تو صحبتِ زندہ دلاں سے تاب پاتی ہے
جو تو ہے کور، سرمے سے جلا کو ڈھونڈتا کیا ہے

قلندر ہیں، کرامات اپنی ہے فیضِ جہاں بینی
نظر ہم سے طلب کر کیمیا کو ڈھونڈتا کیا ہے

حضور

گرچہ جنت بھی تجلی ہے جمالِ یار کی!!
جان کب پائے بجز دیدارِ حق آسودگی!

ہیں خود اپنی اصل سے ناواقف و دور پردہ ہم
اپنی شاخِ آشیاں سے دور رہ گم کردہ ہم!

علم اگر کج فطرت و کج فکر ہے یا بد گہر!
ہے حجاب اکبر اس کا دفترِ فکر و نظر!

علم کا گر مقصد و منشائے اصلی ہو نظر
تو ہمارا جادہ ہے وہ اور ہمارا راہبر!

سامنے رکھتا ہے وہ تیرے خس و خارِ وجود
تاکہ تو یہ پوچھے کیا ہے رازِ پنہانِ وجود!

راستہ تیرے لئے ہموار کر دیتا ہے یوں
دیدہ ہائے شوق کو بیدار کر دیتا ہے یوں

بخش دیتا ہے تجھے وہ درد و داغ و تاب و تب
سارا دن بے چینیاں اور نالہ ہائے نیم شب!!

علم و حکمت کیا ہیں تفسیرِ جہانِ رنگ و بو
دیدہ و دل پاتے ہیں ان کی تجلی سے نمو

لاکے تجھ کو ذروۂ اقصائے جذب و شوق پر!
صورتِ جبریل چل دیتا ہے تنہا چھوڑ کر!

عشق اور خلوت میں غیروں کی گوارا ہمرہی!
خود سے بھی آتی ہے اس کو غیرت و شرمندگی!

ابتداء میں اس کی ہمراہی بھی ہے اور راہ بھی!
انتہا میں بے رفیقِ راہ چلے رہروی

خلد میں آگے بڑھا میں چھوڑ کر حور و قصور
کر دیا جاں کے سفینے کو سپردِ بحرِ نور

چشمِ نرگس کی طرح محوِ تماشائے جمال
ہر نفس وقفِ تغیر اور پھر بھی لازوال

میں کہ تھا سرتا بہ پا غرقِ ضمیرِ کائنات!
ہو بہو مثلِ رباب آئی نظر مجھ کو حیات!

اس کا ہر ہر تار تھا بر جائے خود کامل رباب
ہر نوا تھی دوسری سے خوں چکاں تر شعلہ تاب

ہم ہیں سب رکنِ رکینِ خاندانِ نار و نور
ماہ و انجم، آدمی، روح الامیں جنت کی حور

چشمِ جاں کے سامنے آئینہ آویزاں کیا
اور یقیں کے ساتھ حیرت کو بھی مدغم کر دیا

آج کی صبحِ فروزاں تھی اگر آئینہ کار
دوش و فردا کی تجلی بھی تھی اس سے ہمکنار

حق ہویدا ساتھ لیکر سارے رازِ کائنات
دیکھتا تھا میری آنکھوں سے سراسر اپنی ذات!

دیکھنا اس کا فزونی ہی فزونی بے کمی
دیکھنا وہ قبر تن سے جیسے جاگ اٹھے کوئی!

منتظر اک دوسرے کے عبد و مولا سر بسر
دونوں تھے بے تاب و مشتاقِ وصالِ یکدگر!

زندگی جس جا بھی دیکھو جستجو میں مبتلا!
صید وہ ہے یا کہ میں، یہ عقدہ لاینحل رہا!

عشق شوریدہ نے جاں کو لذتِ دیدار دی
اور زباں کو بے محابا جرأتِ اظہار دی

اے کہ ہے تجھ سے جہاں نور و نظر سے بہرہ ور
اک ذرا چشمِ توجہ خاک دانِ تیرہ پر!

بندۂ آزاد کو یہ خاک داں ناسازگار
اس کے سنبل سے ابھرتے ہیں ہمیشہ نیشِ خار!

جو ہیں بالا دست وہ ہیں غرقۂ عیش و طرب!
زیر دستوں کے مقدر میں شمارِ روز و شب!

ہے ملوکیت کے غلبے سے جہاں تیرا خراب
ہے شبِ تاریک مارِ آستینِ آفتاب!

دانشِ افرنگیاں کا ماحصل غارت گری!!
دیر خیبر بن گئے ہیہات از بے حیدری!

قائلینِ لا الٰہ سب بے کس و بے چارہ ہیں
وائے یہ لامرکزی! فکر و نظر آوارہ ہیں

چار موتیں اس جہاں میں ہیں رہی غلبہ پذیر
تشنۂ خوں سود خوار و والی و ملّا و پیر!!

ایسا عالم کیا ترے شایانِ شاں ہے کبریا
آب و گل اک داغ دامن پر ہے تیرے اے خدا!!

ندائے جمال

کلکِ حق نے یہ نقوشِ بے شمار اچھے بُرے
جو بھی ہم کو ساز گار آئے اجاگر کر دیئے

زندگی کیا ہے تجھے معلوم ہے مردِ نجیب؟
یہ جمال ذاتِ ربانی سے ہے اخذِ نصیب

جذبۂ تخلیق کیا ہے؟ جستجوئے دلربا
جلوہ گر کرنا کسی اک ذات پر اپنی انا!!

یہ سبھی ہنگامہ ہائے رنگ رنگِ ہست و بود
بے تب و تابِ جمالِ حق کہاں پائیں وجود!

زندگی فانی بھی ہے اور ساتھ ہی باقی بھی ہے
یہ ظہورِ ذوقِ خلاقی بھی مشتاقی بھی ہے!!

تو اگر زندہ ہے تو مشتاق ہو خلاق ہو
اور ہماری ہی طرح گیرندۂ آفاق ہو!

توڑ دے اس کو جو ہو تیرے لئے ناسازگار
قلب کی گہرائیوں سے اک نیا عالم ابھار

ہے گراں یہ بات طبعِ بندۂ آزاد پر
زلیست ہو اس کی جہاں میں اور لوگوں کے بسر

جو بشر بیگانۂ اہلیتِ تخلیق ہے
وہ نگاہوں میں ہماری کافر و زندیق ہے!

ق

درگہِ فیاض سے بہرہ نہ اپنا پا سکا!
نخلِ ہستی سے رہا اپنے ثمر نا آشنا!

مردِ حق اٹھ تیز تر ایں صورتِ شمشیر بن!
خود ہی تو اپنے جہاں کا خالقِ تقدیر بن!

زندہ رود

کیا ہے رسم و راہ و آئینِ جہانِ رنگ و بو؟
یہ کہ آبِ رفتہ لوٹے پھر نہ سوئے آبجو!!

زندگی سیارہ ہے ٹکرا نہ پر مائل نہیں!
بار بار اک راہ پر گلگشت کی قائل نہیں!

ہے تہہِ گردونِ گرداں غیر ممکن واپسی
گر پڑی اک بار جو ملت وہ پھر کب اٹھ سکی!

مر کے کوئی قوم پھر مرقد سے اٹھ سکتی نہیں
چارہ غیر صبر و قبر اس کے لئے کوئی نہیں!

ندائے جمال

زندگی ہرگز نہیں دن رات تکرارِ نفس
اصل اس کی ایک ذاتِ حی و قیوم اور بس

اس سے قربِ جاں کہ جس کا قول ہے انّی قریب
ہے حیاتِ جاوداں سے آپ ہی پانا نصیب!

فیض سے توحید ہی کے فرد دلاہوتی بنے
اور اسی کے صدقے میں ملّت بھی جبروتی بنے!

بایزید و شبلی و بوذر اسی کے دم سے ہیں
امتوں میں طغرل و سنجر اسی کے دم سے ہیں

بے تجلی کے نہیں انسان کو حاصل ثبات
فرد و ملت کو ہمارا جلوہ سامانِ حیات!

دونوں کو توحید کی قوت سے حاصل ہو کمال
ایک کا حصہ جلال اور اک کا اعجازِ کمال!

وہ ہے سلمانی سراسر اور سلیمانی ہے یہ
وہ سراپا فقر اور اقبال سلطانی ہے یہ

وہ فقط واحد کو دیکھے اور یہ واحد بنے!

ہمنشیں اس کا رہے انسان ساتھ اس کے جئے

کیا ہے ملت اے کہ تو کرتا ہے وردِ لَا اِلٰہ ؟
آنکھیں ہوں ہر چند لاکھوں ایک ہو لیکن نگاہ!

اہلِ حق کا دعوے و حجت سوا اس کے ہے کیا
دل ہمارے ایک ہیں گو شامیانے ہیں جدا!

یک نگاہی سے بنے ذرات مل کر آفتاب
یک نگہ ہو جا کہ نورِ حق ہو تجھ پر بے حجاب!

مت گماں کر یک نگاہی ہیچ ہے کچھ بھی نہیں
ہیں تجلی ہائے توحید اس میں اعجاز آفریں

جذبۂ توحید جب ملت کو دیتا ہے اُبھار
قوت و جبروت کی ہو جاتی ہے سرمایہ دار

روحِ ملت کے لئے سامانِ ہستی انجمن
روح ملت کی نہیں ہوتی ہے محتاجِ بدن

تب تلک ملت بھی ہے جنگ ہے ربطِ باہمی
مٹ گئی ملت یہ جمعیت جونہی برہم ہوئی

مردہ ہے تو، یک نگاہی کی مدد سے زندہ ہو
چھوڑ دے لامرکزی کو تاکہ تو پائندہ ہو!

وحدتِ افکار و سیرت دونوں پیدا کر بہم
تاکہ ہو آفاق میں فرمانروا صاحب حشم

زندہ رود

کون ہوں میں، کون تو، اور عالم امکاں کہاں؟
کیوں ہیں ہم میں دوریاں، کیوں ہے یہ پردہ درمیاں؟

میں ہوں کیوں وابستۂ تقدیرِ ربِّ دو جہاں؟
میں ہوں فانی اور تجھے حاصل حیاتِ جاوداں

ندائے جمال

رہ چکا ہے اس جہانِ چار سو میں تو مکیں
جو بھی اس میں کھو گیا جز مرگ اسے چارہ نہیں

پیش کر اپنی خودی گر زیست کا خواہاں ہے تو
غرق کر دے اپنے اندر یہ جہانِ چار سو!

پھر سمجھ جائے گا خودی میں ہوں کون اور تو ہے کیا
اور اس دنیا میں تو کیسے مرا کیسے جیا!

زندہ رود

ہاں اس مردِ ناداں کی ہے لے ربِّ العلیٰ
چہرۂ تقدیر سے پردہ ہٹا دے اک ذرا

میں نے دیکھے روسیوں اور جرمنوں کے انقلاب
اور مسلمانوں کے دل میں محشرِ صد اضطراب

دیکھیں آنکھوں نے مری تدبیر ہائے شرق و غرب
اک نظر دکھلا دے اب تقدیر ہائے شرق و غرب

تجلّیٔ جلال

ناگہاں پیشِ نظر پھر ہو گیا اپنا جہاں
دُور تا حدِّ نگہ پھیلے زمین و آسماں

غرقۂ نورِ شفق گوں اس کی وہ پہنائیاں!
سُرخ صندل کی طرح پھیلی ہوئی پرچھائیاں!

آپڑی دل پر مرے برقِ تجلائے الست
کر دیا مثلِ کلیم اللہ ان جلووں نے مست

نور نے پردے ہٹائے ہر نہفتہ راز سے!
سلب کر لی طاقتِ گفتار اس اعجاز سے

سب ضمیرِ عالمِ بے چند و چوں تھا چاک چاک
اس کی گہرائی سے نکلی اک صدائے سوزناک

"چھوڑ مشرق کو نہ رکھ سینے میں مغرب کی بھی لو!
کر نہیں جو کے بھی پاسنگ یہ سب کہنہ و نو
وہ نگیں جس کو گنوا بیٹھے ہو شیطان کے ہاتھ
اس کو جبریل کے بھی پاس نہیں رکھتے گرو
خود نگہدار بھی ہے انجمن آرا بھی حیات
۱۸۲۰ رہ الگ، ساتھ بھی چل سب کے تو اے قافلہ رو
مہرِ تاباں سے تری تاب و تب افزوں تر ہے!
اس طرح جی کہ ہر اک ذرّے کو پہنچے پہ تو!
ایسے تنکوں کی طرح جو ہوں ہوا کی زد میں
گئے اسکندر و دارا و قباد و خسرو!
ہے تنک جامی سے میخانہ بھی رسوا ہم سے
جام لے، ہوش سے پی، خوش تری سرمستی تو!"

جاوید سے خطاب

(نئی پود سے کلام)

جاوید سے خطاب

(نئی پود سے کلام)

سعیِ لاحاصل ہیں یہ میری سخن آرائیاں
دل میں جو کچھ ہے نہاں آتا ہے وہ تا لب کہاں

کر چکا ہوں سینکڑوں نکتے اگرچہ بے نقاب
ایک نکتہ اور بھی باقی ہے بیرونِ کتاب!

گر بیاں کیجے اسے تو اور بھی پیچیدہ ہو!
پیکرِ الفاظ سے کچھ اور بھی پوشیدہ ہو!

سوزِ اس کا یا تجھے میری نگاہوں سے ملے
یا سراغ اس کا سحر کی گرم آہوں سے ملے

تیری ماں نے تیرا دیرس اولیں تجھ کو دیا!
غنچۂ خاطر نسیمِ صبحگاہی سے کھلا

تیرے رنگ و بو کا سرچشمہ وہی بادِ نسیم
اس کی موجوں نے بنایا ہے تجھے دُرِ یتیم

دولتِ جاوید پائی اس کے دم کے سوز سے
لَا اِلٰہ اسکھا لبانِ گفتگو آموز سے!

مجھ پہ اے نورِ نظر موقوف ہے ذوقِ نگاہ
میرے ہی ذمہ ہے سوزِ و التہابِ لَا اِلٰہ

لَا اِلٰہ کا ورد کرنا ہے تو جان و دل سے کر
تاکہ چھا جائے تری رگ رگ پہ جاں ہی کا اثر

مہر و مہ کی گردشیں موقوفِ سوزِ لَا اِلٰہ!
میں نے دیکھا ہے نہاں اس کو درونِ کوہ و کاہ

یہ دو حرفِ لا الٰہ گو ظاہراً گفتار ہیں
در حقیقت یہ دمِ شمشیرِ بے زنہار ہیں

لا الٰہ اک ضرب ہے اور ضرب وہ کاری بھی ہے
جینا اس کے سوز سے رحمت بھی قہاری بھی ہے

مومن اور طوقِ غلامی، مومن اور باندھے نطاق
مومن اور رسم و رہِ غداری و فقر و نفاق!

بیچ ڈالے دین و ملت، کو برائے نیم دام!
ساز و ساماں ہی نہیں، وہ پھونک ڈالے گھر تمام

لا الٰہ وردِ زمانہ اس کا کبھی تھا اب نہیں
نعرۂ سر باز تھا نہ اس کا کبھی تھا اب نہیں

نور کے جلوے سے اب بیگانہ ہیں صوم و صلوٰۃ
جذبۂ اخلاص سے خالی ہے مسلم کی حیات!

وہ کہ تھا اللہ ہی اللہ اس کا ساز و برگ
بن گیا ہے اس کا فتنہ حبِ مال و ترسِ مرگ

کھو گیا اس طرح اس کا ذوق و مستی نذرِ شور
بند اس کا دیں کتابوں میں وہ خود مدفونِ گور

صحبتِ عصر اس کے دل میں اس طرح گھر کر گئی
اس نے دو پیغمبروں سے دین کی تعلیم لی!

ایک ایرانی نہاد اور دوسرا ہندی نہاد
حج سے وہ بیگانہ اور یہ حامیٔ ترکِ جہاد

جب جہاد و حج نہ ٹھہرے شرعِ دیں کے محکمات
ہو گیا بے جان سارا پیکرِ صوم و صلوٰت

دین بے جاں ہو گیا جب بے صلوٰت و بے امام
فرد ناہموار اور ملت ہے محرومِ نظام!

حیف وہ سینہ کہ جس میں گرمیٔ قرآں نہ ہو
ان سے امید بھی کیا۔ جن میں کوئی جاں نہ ہو

ترکِ خود سے مردِ مسلم کیا سے اب کیا ہو گیا
المدد اے خضر پانی سر سے اونچا ہو گیا

کیا ہوئے وہ سجدے جن سے کانپ اٹھتی تھی زمیں
مہر و مہ گردش میں جیسے ان کے تھے زیرِ نگیں!

پتھروں پر بھی پڑیں ان گرم سجدوں کے نشاں
ق
تو وہ اڑ جائیں فضا میں یک بیک بنکر دھواں!

دورِ حاضر سرنگونی کے سوا کچھ بھی نہیں
ضعفِ پیری کی زبونی کے سوا کچھ بھی نہیں

اب کہاں شانِ دشکوہِ ربی الاعلیٰ بھلا
یہ قصور اس کا ہے یا ہے خود ہماری ہی خطا؟

ہر کوئی اپنی ہی رہ پر بے تحاشا تندرد
ہے ہمارا ناقہ گمرہ بے مہار اور ہرزہ دد!

صاحبِ قرآں تو ہے لیکن ہے بے ذوقِ طلب
العجب ثم العجب ثم العجب ثم العجب!

گر خدا تجھ کو کرے ذوقِ نظر سے بہرہ ور
جو زمانہ آرہا ہے دیکھ آنکھیں کھول کر:

عقلیں بے باک اور دل بیگانۂ سوز و گداز
بے حیا، بے شرم آنکھیں غرقِ لذاتِ مجاز

یہ بلا دین و سیاست، علم و فن اور عقل و دل
سب کے سب مل جل کے ہیں گرمِ طوافِ آب و گل:

سرزمینِ ایشیا وہ مرزبومِ آفتاب!
غیر پر نظریں جمائے خود سے ہے زیرِ حجاب!

اس کا دل نا آشنائے واردات نو بنو!
اس کے حاصل کا زمانے میں عوض کم تر زجو:

اس قدر ناسازگار اس کو ہوئیہ دیرینہ دیر
زلیست اس کی ساکن و یخ بستہ دبے ذوقِ سیر!

میں نے اس کے دل کو کرب و درد سے خوں کر دیا
جوش و مستی سے جہاں اس کا دگرگوں کر دیا

دو طرح کا عصر کو میں نے کلام اپنا دیا:
اور دو ظرفوں میں ہے بحرین کو سمٹا دیا

ایک پیچیدہ کلام، انداز اس کا نیش دار
تا کرے عقل و دلِ مرداں کی تدبیرِ شکار

دوسرا نغمہ دار جو ہے روکشِ وضعِ فرنگ
نالۂ مستانہ بیروں جستۂ آغوشِ چنگ!

ایک کا سرچشمہ ذکر اور دوسرے کا غور و فکر
کاش آئے تیرے حصے میں یہ ذوقِ فکر و ذکر

میں وہ دریا ہوں کہ دو بحروں سے جس کی اصل ہے
فصل میرا فصل نیز آئینہ دارِ وصل ہے!

جب سے میرے عصر کی بدلی ہے افتادِ مزاج
کر لیا ہے میں نے ایجاد اور طرزِ احتجاج!

نوجواں ہیں تشنہ لب، تشنہ دہاں، خالی ایاغ
شستہ چہرے، تیرہ و تاریک دل، روشن دماغ

کم نظر کم ظرف بزدل، تنگ دل اور بے امید
طاقتِ دیدار ان کی آنکھوں میں ہے بدتر از شنید

ناکس و نااہل منکر آپ سے، مومن بغیر!
خاک سے ان کی بنائیں اینٹیں معمارانِ دیر!

اپنے مقصد سے کوئی مکتب کہاں آگاہ ہو!
جب کہ تا جذبِ دروں اس کی نہ کوئی راہ ہو!

نورِ فطرت اس نے دھو ڈالا ہے اپنی جان سے
شاخ سے ممکن کہاں کوئی گلِ رعنا اُگے!

خشت کج رکھتے ہیں جو معمار کہیئے ان کو کیا
حیف اگر ہو بچۂ شاہیں کو خوئے بط عطا

علم کو جب تک نہ بخشے سوز خود لمسِ حیات
دل ہو کیا لذت پذیرِ کیف و رنگِ واردات!

تیری ہی شرحِ مقامات اور کیا کردارِ علم
تیری ہی تفسیرِ آیات اور کیا آثارِ علم

نارِ جس میں پہلے تجھ کو آپ جلنا چاہیئے؛
تا کہ مس کو سیم سے انساں ممیز کر سکے!

علمِ حق اول ہے ادراکِ حواس، آخر حضور!
انتہا اس کی نہیں منت کشِ ظرفِ شعور!

پڑھتا ہے ہر چند استادوں سے تو صد ہا کتاب — اس سے بہتر ہے کہ ہو فیضِ نظر سے بہرہ یاب
مے سے جو ریزاں ہو نظر کے ساغرِ اعجاز سے — ہر کوئی ہو مست اس سے اور ہی انداز سے!
وہ دمِ بادِ سحر بجھ جاتے ہیں جس سے چراغ — لالہ ہوتا ہے اسی کے فیض سے گلگوں ایاغ
کم خورد کم خواب ہو، کم گو و کم گفتار ہو! — اپنے گرد اگر دگرداں صورتِ چرخہ کار ہو!!
پیشِ ملایاں ہے کافر منکرِ ذاتِ خدا — منکرِ خود میری نظروں میں ہے کافر کے سوا
وہ بد انکارِ وجودِ کبریا یکسر عجول[1]!! — یہ عجول اور ساتھ ہی عینِ ظلوم یا عینِ جہول
خوب محکم دل میں پیدا شیوۂ اخلاص کر — میر و سلطاں کا نہ دل میں لا کوئی خوف و خطر
دامنِ انصاف تیرے ہاتھ میں محکم رہے — سلسلہ فقر و غنا میں قصد[2] کا ہر دم رہے!
حکم ہے دشوار، تاہم اس کی تاویلیں نہ ڈھونڈ! — اپنے ہی دل کے سوا تو اور قندیلیں نہ ڈھونڈ
حفظِ جاں ممکن نہیں جز ذکر و فکرِ بے حساب — اور حفظِ تن ہے ضبطِ نفس دورانِ شباب
اس جہانِ پست و بالا میں کہ ہے انساں مکیں — حاکمی بے حفظِ جان و تن کبھی ممکن نہیں!

---

۱ - قرآن (۱۷ - ۱۱) وکان الانسان عجولا - اور تحقیق انسان جلد باز پیدا ہوا ہے -

۲ - قصد - میانہ روی

لذتِ سیر و تماشا ہی ہے مقصودِ سفر
ہے نظر گر آشیانے میں تو مت پرواز کر

چاند کا گردش سے مقصد ہے کہ پالے اک مقام
سیرِ آدم کے لئے ایسا ارادہ ہے حرام

زندگی صاحب دلوں کی سیر ہے، پرواز ہے
آشیاں کا اس کی فطرت سے بھلا کیا ساز ہے!

رزق کوّوں اور گدھوں کا قبر کی مٹی میں ہے
رزقِ بازاں مہر و مہ کے عالمِ علوی میں ہے

سرِّ دیں کیا چیز ہے؟ صدقِ مقال، اکلِ حلال
خلوت و جلوت، ہے دونوں میں تماشائے جلال

راہِ دیں میں سخت بن کر صورتِ الماس جی
ذاتِ حق سے لو لگائے اور بے وسواس جی

ایک راز اسرارِ دیں سے تجھ پہ کرتا ہوں عیاں
داستاں شاہِ مظفر کی ہے جس کی ترجماں[1]

تھا جو اخلاصِ عمل کے باب میں فرد و فرید
تا جور تھا اور تقدس میں مثال بایزید

ایک گھوڑا اس کو پیارا صورتِ اولاد تھا
سخت کوشش آگاہی کے مانند ہنگامِ وغا

سبزہ رنگ اور نسل میں مثلِ نجیبانِ عرب
تیز گام اور باوفا، بے عیب، پاکیزہ نسب!

بندۂ مومن کو ہے محبوب کیا اے نکتہ رس؟
پہلے قرآں بعد ازاں شمشیر براں، پھر فرس!

کیا بتاؤں خوبیاں، تھا وہ فرس خیر الجیاد[2]
کوہ و دریا سے گذر جاتا تھا جیسے موجِ باد!

---

۱ - مظفر بن سلطان محمود بیگڑہ، گجرات کا ایک تاجدار -

۲ - خیر الجیاد - اصیل اور اعلیٰ نسل کا گھوڑا -

جنگ کے دن وہ نظر سے بھی کہیں سیار تر
اک ہوائے تند جولاں، طائفِ کوہ و کمر!

تھی لگا پو اس کی یا ہنگامہ ہائے رستخیز
سنگِ خارا بھی ہو جس کی ضربِ سُم سے ریزہ ریزہ

ایک دن یہ جانور مانندِ انساں ارجمند
ہو گیا دردِ شکم سے بے طرح زار و نژند

بہرِ دفعِ درد پلوائی طبیبوں نے شراب
کر دیا دُور اس طرح اس کے شکم کا پیچ و تاب

مردِ حق نے پھر نہ فرمایا طلب وہ تیز گام
شرحِ تقویٰ اور ہے کچھ اور رسم و راہِ عام

اے کہ حاصل ہو تجھے اللہ سے قلب و جگر
دیکھ اک مردِ مسلماں کا یہ اندازِ نظر!

دیں کیا ہے شعلۂ جوالۂ ذوقِ طلب
انتہا ہے عشق، اس کی ابتدا حسنِ ادب

آبروئے گل ہے موقوفِ جمالِ رنگ و بو
بے ادب انساں ہے بے رنگ و بو، بے آبرو

دیکھتا ہوں نوجوانوں میں جو فقدانِ ادب
دل مرا تاریک ہو جاتا ہے مثلِ تیرہ شب!

یاد آتا ہے مجھے عہدِ نبی بے اختیار
اک تڑپ اٹھتی ہے پہلو میں مرے سینہ فگار

عہد سے اپنے کچھ ایسی شرم آتی ہے مجھے
دامنِ ماضی میں چھپ جاتا ہوں تسکیں کیلئے

سترِ عورت دامنِ شوہر ہے یا خاکِ لحد
سترِ مرداں حفظِ خود از صحبتِ یارانِ بد

حرفِ بد لانا زباں پر ناسزا، عینِ خطا
ہو کوئی کافر کہ مومن ہیں سبھی خلقِ خدا

آدمیت پاسدارِ احترامِ آدمی
رکھ سدا پیشِ نظر اوجِ مقامِ آدمی

معنیٔ انسانیت ہے ربط و ضبطِ تن بہ تن
تو طریقِ دوستی پہ رہ برابر گامزن!

بندگانِ عشقِ حق سے پاتے ہیں سیدھا طریق — کوئی کافر ہو کہ مومن سب پہ وہ یکساں شفیق
کفر و دیں دونوں کو سمٹائے ترا پہنائے دل — جائے صد افسوس ہے دل سے اگر کترائے دل

ظاہراً ہر چند ہے دل پائے بندِ آب و گل
غور سے دیکھو تو سب آفاق ہے آفاقِ دل

گرچہ ہو جاہ و حشم میں خسرو و قیصر و لے — فقر کے عز و شرف کو ہاتھ سے جانے نہ دے
ہر رگِ جاں میں تری ہے سوز اس کا جاگزیں — یہ مئے کہنہ ترے آباء کی ہے تو اے امیر
اس جہاں میں غیر دردِ دل کوئی ساماں نہ مانگ — حق سے ہو جو بہرِ نعمت، دولتِ سلطاں نہ مانگ
دہر میں کتنے ہی مردانِ حق اندیش و بصیر — بے بصر ہو جاتے ہیں جب مال و دولت ہو کثیر
کثرتِ نعمت ہوئی اور سوزِ دل رخصت ہوا — مٹ گئی خوئے نیاز اور ناز پیدا ہو گیا
ایک مدت گرچہ بازارِ جہاں کی سیر کی — اہلِ زر کی آنکھ کو پایا نہ میں نے کم کبھی

میں فدا اس پر بصر جس کی فقیرانہ ہوئی
وائے ان پر زیست جن کی حق سے بیگانہ ہوئی!

تو نہ ڈھونڈ اے جاں مسلمانوں میں ولیا ذوق و شوق — وہ یقیں وہ رنگ و بو، وہ حیرت افزا ذوق و شوق
علمِ قرآنی سے عالم نابلد اور بے نیاز — اور صوفی بھیڑیے خونخوار اور گیسو دراز
خانقاہیں گرچہ ہیں ہنگامہ زارِ ہا و ہو — اب کہاں وہ زندہ دل مے سے ہو پرِ جن کا سبو
دوسری جانب مسلمانانِ افرنگی مآب — ڈھونڈتے ہیں چشمۂ کوثر تہِ موجِ سراب

بے خبر سے بے خبر ہیں جانیں کیا وہ سرِّ دیں — یہ کہاں کے اہلِ دیں، سب اہلِ کیں ہیں اہلِ کیں

خیر خواہی، دردمندی، حزبِ خاصاں پر حرام — جوہرِ صدق و صفا ہے مالِ جمہورِ انام!

غور سے کر امتیازِ اہلِ دین و اہلِ کیں — کر تلاشِ ہمنشینِ حق، ہو اس کا ہمنشیں

کرگسوں کی اس جہاں میں رسم و آئیں اور ہے

کرّ و فرِّ سطوتِ پروازِ شاہیں اور ہے

مردِ حق نازل فرازِ آسماں سے مثلِ برق — ایندھن اسکی آگ کا ہیں شہر و دشتِ غرب و شرق!

۱۹ ہم ابھی تاریکیوں میں کھوئے بے راہ و نشاں — اور وہ پیہم شریکِ اہتمامِ دو جہاں!

وہ کلیمؑ اور وہ مسیحِ ناصری اور وہ خلیلؑ — وہ محمدؐ، وہ کتابِ پاک اور وہ جبرئیل

وہ سراسر آفتابِ کائناتِ اہلِ دل! — اس کی جاں پرور شعاعوں سے حیاتِ اہلِ دل!

پہلے وہ ہم کو تپاتا ہے خود اپنی آگ میں — پھر وہ رسمِ جہانبانی سکھاتا ہے ہمیں

صاحبِ دل بنتے ہیں ہم سب تو اسکے سوز سے — ورنہ ہم کیا ہیں وہی آب اور گل کے شعبدے

ہے گماں مجھ کو کہ تو جس عصر میں پیدا ہوا — وہ بدن میں غرق ہے اور جان سے نا آشنا

قحطِ جاں سے جب بدن کوڑی کے مول ارزاں نہیں — مردِ حق مستور ہو جاتا ہے اپنے آپ میں

ڈھونڈنے سے وہ کبھی دنیا کو ہاتھ آتا نہیں — گرچہ وہ مردِ خدا ہو سامنے مسند نشیں!

چھوڑ مت زنہار پھر بھی اس کی سعئ جستجو — کتنے پیچ و تاب ہی میں مبتلا ہو گرچہ تو

بندۂ آگاہ ایسا گر نہ ہاتھ آئے تجھے — نذر ہے تیری ملا جو کچھ مجھے اجداد سے

پیرِ رومی کو بنا اپنا رفیقِ راہِ راز
تاکہ حق تجھ کو عطا کر دے وہی سوز و گداز

چونکہ رومی جانتا ہے خوب فرقِ مغز و پوست
پاؤں مضبوطی سے رکھتا ہے میانِ کوئے دوست

اس کی شرحیں کیں مگر اس کو نہ کوئی پا سکا!
ہو گئے معنی غزالوں کی طرح رم آشنا!

دفترِ معنی سے کیا سیکھا بجز رقصِ بدن
رقصِ جاں سے بند کر لیں آنکھیں، وا رہا تن پہ من

رقصِ تن گردش میں لائے صرف مشتِ خاک کو
رقصِ جاں کرتا ہے بر ہم گنبدِ افلاک کو

علم و حکمت کے خزانے رقصِ جاں سے ہاتھ آئیں
کیا زمیں کیا آسماں سونہ نہاں سے ہاتھ آئیں

فرد ہو اس کی بدولت صاحبِ جذبِ کلیم
اور ملت اس کے باعث وارثِ ملکِ عظیم ۹۵۰

رقصِ جاں کا سیکھنا دشوار سا دشوار ہے
غیرِ حق کا پھونک دینا حاصلِ صد کار ہے

حرص و غم کی آگ میں جب تک جگر جلتا رہے
کس طرح پیدا ہوں دل میں رقصِ جاں کے ولولے

ضعفِ ایماں کی علامت، وجہ دلگیری ہے غم
اے جواں سن گوشِ جاں سے نصف پیری ہے الم

جان لے تو فقرِ حاضر[2] ہے فقط حرص و ہوا!
حق غلام اس کا جو رکھے ضبط میں اپنی انا!

اے کہ تو ہے باعثِ تسکین جانِ بیقرار
تیری مشتِ خاک ہو گر رقصِ جاں کی مایہ دار

سرِ دینِ مصطفٰے[1] دینِ ھدیٰ تجھ کو کہوں
گوشۂ مرقد میں بھی تجھ کو دعا دیتا رہوں

۱- حدیث شریف - الھم نصف الھرام - ۲ - حدیث شریف - ایاکم والطمع فانہ فقر الحاضر -